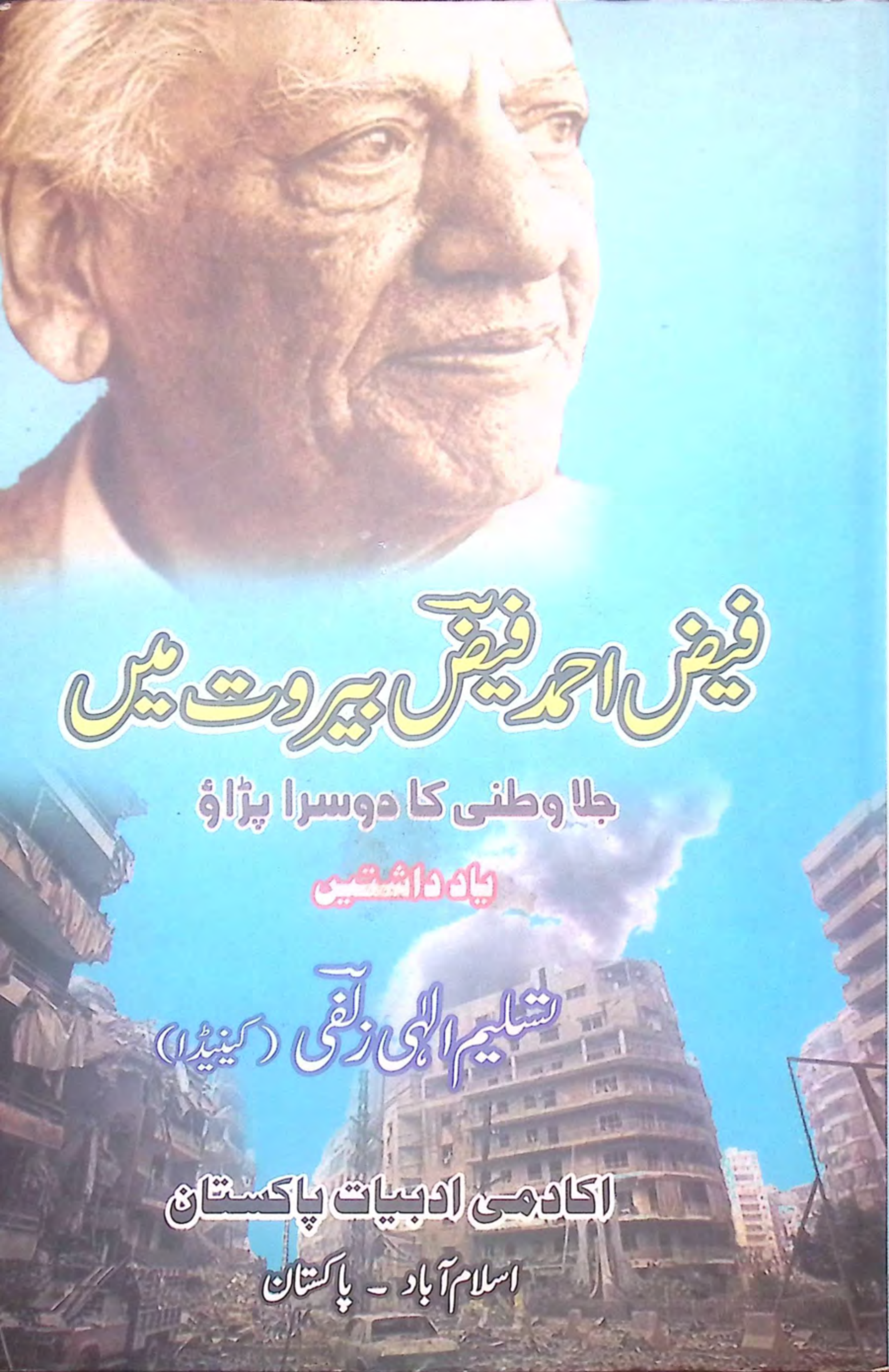


# فیض احمد فیض بیروت میں

## جلا وطنی کا دوسرا پڑاؤ

یاد داشتیں

تسلیم الٰہی زلفی (کینیڈا)

اکادمی ادبیات پاکستان

اسلام آباد ۔ پاکستان

# فیض احمد فیضؔ بیروت میں

## جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ

### یاد داشتیں

تسلیم الٰہی زلفیؔ
(کینیڈا)

اکادمی ادبیات پاکستان
اسلام آباد۔ پاکستان

# فیض احمد فیضؔ بیروت میں

## جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ

### یاد داشتیں

تسلیم الٰہی زلفیؔ
(کینیڈا)

| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | فیض احمد فیض بیروت میں |
| | | (جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ) |
| نگران | : | فخر زمان |
| تدوین وطباعت | : | طارق شاہد |
| مصنف | : | تسلیم الٰہی زلفی |
| پہلی اشاعت | : | فروری 2011ء |
| ناشر | : | اکادمی ادبیات پاکستان، |
| | | پطرس بخاری روڈ، H-8/1، اسلام آباد |
| مطبع | : | ماریہ پرنٹرز، اسلام آباد |
| قیمت | : | (پاکستان میں) ۵۰۰ روپے |
| | | (بیرون ملک) ۱۰ ڈالر |

ISBN: 978-969-472-264-1

**Faiz Ahmed Faiz in Beirut**

Reminiscence of

**Tasleem Elahi Zulfi**

(Canada)

Published by

**Pakistan Academy of Letters**

Islamabad - Pakistan

# پیش نامہ

## فیضؔ صاحب کی زندگی کے چار اہم سال

فیض احمد فیضؔ کے فن وشخصیت، زندگی کے حوالے سے اب تک درجنوں کتابیں اور سیکڑوں مضامین ومقالے لکھے جانے کے باوجود، اُن کی زندگی میں قیامِ بیروت کے وہ چار اہم سال ابھی تک منصہ شہود پر نہیں آئے تھے' جو اِس کتاب کے فاضل مصنف تسلیم الٰہی زلفی نے نہایت ذمّے داری اور اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قلم بند کیے ہیں۔

زلفیؔ صاحب نے بیروت میں اپنے عرصۂ قیام کے دوران، فیضؔ صاحب کی غریب الوطنی، تنہائی اور فکری تلاطم کے نہایت ہی اہم چار سالہ دور کی نایاب یاد داشتیں لکھ کر اُن کی زندگی کی کتاب کو مکمل کر دیا ہے۔ کتاب ''فیض احمد فیضؔ بیروت میں'' سے آنے والی نسلیں فیض احمد فیضؔ کے ۷۷ سالہ عرصۂ حیات میں بیروت میں قیام کے چار سال سے آگاہی حاصل کر سکیں گی۔

کینیڈا میں آباد، تسلیم الٰہی زلفی دنیائے اردو ادب کے نامور اسکالر ہیں، پچاس سالہ ادبی سفر کے عرصے میں اب تک ان کی سترہ گرانقدر تصنیفات منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ یہ امر باعثِ امتنان ہے کہ کینیڈا میں سرکاری وادبی اداروں کی سطح

پراور امریکہ، برطانیہ، پاکستان، ہندوستان اور شرقِ اوسط میں علمی و ادبی اداروں کی جانب سے انہیں صدہا اعترافی اسناد، وثیقوں، کیش ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ خود فیضؔ صاحب نے زلفیؔ صاحب کے دوسرے شعری مجموعے ''دستاویز'' کے پیش لفظ میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیحد سراہا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری کی ہدایت پر سال 2011ء کو فیض احمد فیض سال کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ ''فیض احمد فیض سال'' کے اہم موقع پر اکادمی ادبیات پاکستان صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری کی خصوصی ہدایت پر اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت ''فیض احمد فیضؔ بیروت میں'' جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ، شائع کر رہی ہے۔ کتاب فیض احمد فیض کی بیروت میں شب و روز کے حوالے سے پہلی اور اہم کتاب ہے۔ اب تک فیض احمد فیض کی بیروت میں شب و روز کی تفصیلات سامنے نہیں آئی تھیں اس کتاب کے ذریعے ان کا یہ گوشہ بھی سامنے آئے گا۔ یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کی اہم کتابوں میں سے ایک ہوگی۔ اکادمی ادبیات پاکستان اس سے پہلے سہ ماہی ''ادبیات'' کا 'فیض احمد فیض نمبر' اور اکادمی کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے تحت 'فیض احمد فیض: شخصیت اور فن' شائع کر چکی ہے۔

فخر زمان

# عرضِ مُصنّف

بیروت میں قیام کے دوران جہاں مجھے فیضؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے، ان کے صوفیانہ اور درویشانہ اوصاف سے اپنی عملی زندگی کو سنوارنے کا موقع مِلا۔ وہاں میں نے ان کی دوسری جلاوطنی کے پڑاؤ کے عرصے میں، ان کی تنہائی اور فکری تلاطم کے نقوش، ان کے پورے وجود پر پر مرتسم ہوتے بھی دیکھے۔ ''فیض احمد فیض بیروت میں'' ایک ایسی دستاویز ہے جس میں فیضؔ صاحب کے بیروت میں گزارے چار برسوں کی مکمل داستان منصۂ شہود پر لائی گئی ہے:

☆ ۱۹۷۸ء میں جدّہ سعودی عربیہ سے میری بیروت آمد اور فیضؔ صاحب سے رابطہ

☆ ''لوٹس میگزین'' کے چیف ایڈیٹر فیض احمد فیضؔ کی بھاری ذمّہ داریاں

☆ محمود درویش، شرقِ اوسط کا فیض احمد فیضؔ۔ دو بڑے شاعروں کی دوستی

☆ بیروت کے تاریخی مقامات میں فیضؔ صاحب کی دلچسپی

☆ بیروت میں ''مرے دل، مرے مسافر'' کی شانِ نزول

☆ بیروت اور غزّہ کی دبی دبی چیخیں اور درد کی کراہیں، فیضؔ صاحب کی ''بیروتی'' شاعری میں

☆ ہم کہ بیروت میں فیضؔ صاحب کے ''اکلوتے'' سخن فہم!

☆ بیروت میں پاکستانی سفارت خانے کی فیضؔ صاحب سے پہلو تہی

☆ بیروت میں قیام کے دوران، فیضؔ صاحب کے بیرونی ممالک کے دورے

☆ ہماری ''عربی ترجمانی'' میں فیضؔ صاحب کی یاسر عرفات سے ملاقاتیں، عربی شعروادب پر گفتگواور ''مرے دل، مرے مسافر'' کی شاعری کو ''ابوعمار'' کے نام کرنے کا فیصلہ

☆ عرب مغنّیہ فیروزؔ کی آواز کا جادو فیضؔ صاحب پر چل گیا۔ ہمارے ساتھ بیروت کنسرٹ میں شرکت

☆ بیروت میں فیضؔ صاحب کی قیام گاہ بمباری کی زد میں۔ بیگم ایلسؔ فیض کی پاکستان واپسی

☆ سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایفروایشیائی مصنفین کی تحریک اوراس کا ترجمان ''لوٹس'' سب اپنے انجام کو پہنچے اور فیضؔ صاحب کی بیروت سے رخصت یہ اور بہت سی دوسری وہ باتیں ہیں جو سیاق وسباق کے ساتھ، ترتیب وار اس دستاویزی کتاب میں درج کی ہیں۔

فیضؔ صاحب پر اِس کتاب کی اہمیت اور انفرادیت کے پیشِ نظر چیئر مین اکادمی ادبیاتِ پاکستان فخر زمان صاحب نے اکادمی کے اشاعتی منصوبے کے تحت فیض احمد فیضؔ صدی کے موقع پر میری تصنیف ''فیض احمد فیضؔ بیروت میں'' کو جس سرگرمی اور سلیقے کے ساتھ زیورِ طباعت سے آراستہ کیا ہے اس کے لیے میں ''اکادمی ادبیاتِ پاکستان'' کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

تسلیم الٰہی زلفیؔ

(کینیڈا)

# فیض احمد فیضؔ بیروت میں

## جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ

جامعہ کراچی سے انجینئرنگ میں ماسٹرز کی ڈگری پانے کے بعد ہمارا اپنے والدین کے پاس سعودی عربیہ واپس جانے کا وقت آیا تو کراچی کے علمی اور ادبی حلقوں سے وابستگی اور اسی قبیل کی سرگرمیوں کے ناتے' روزنامہ ''جنگ'' اور دیگر اخبارات میں ہماری تصویر کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی کہ ہم پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سعودی عربیہ اپنے والدین کے پاس واپس جا رہے ہیں اور وہاں سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیروت (لبنان) جائیں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہمارے تعلیمی دور کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ افکار'' شائع ہو چکا تھا۔ اب کا تو ہمیں معلوم نہیں البتہ اُس وقت، تعلیمی دور میں کسی کا شعری مجموعہ شائع ہونا پہلی اور نئی بات تھی! سعودی عربیہ واپسی کے بعد، وہاں ہم سعودی ائر لائنز سے وابستہ ہو گئے اور یوں کئی سال ملازمت کی گہما گہمی میں گزر گئے۔ اسی دواران ہماری شادی بھی ہو گئی۔ گویا ازدواجی ذمہ داریاں بھی زندگی میں در آئیں۔ آگے پڑھنے لکھنے کا معاملہ پسِ پشت پڑ گیا اور امریکن یونیورسٹی بیروت سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کی ہماری خواہش سرد پڑ گئی لیکن بالآخر حالات سازگار ہو گئے۔ ہم نے ۱۹۷۸ء میں

''ہنگامی'' طور AUB میں اپنا رجسٹریشن کروایا اور بیروت چلے گئے۔

بیروت کی تعلیمی گہما گہمی اور مصروفیات کا ابتدائی عرصہ گزارنے کے بعد جب ذرا معمولاتِ روز وشب اعتدال پر آئے تو ایک غزل کی آمد ہوگئی۔ اتنے دن کے بعد غزل کہہ کر دل کو ایک لطیف کیف وسُرور مِلا اور اُسی کیفیت میں ہمیں فیضؔ صاحب کا خیال آیا۔ تصور ہی تصور میں ہم نے فیضؔ صاحب کو دیکھا.... بیروت شہر..... ایفرو ایشیائی ادبی انجمن کے سہ ماہی مجلّے ''لوٹس'' کا دفتر، چیف ایڈیٹر کی کرسی، جلتا سگریٹ، چلتا قلم اور سوچتی آنکھیں۔ اُس وقت دن کے دس بجے تھے، ہم ٹیکسی سے ''لوٹس'' کے دفتر جا اترے۔ فیضؔ صاحب کے تصور سے جو منظر ہمارے ذہن کے پردے پر ابھرا تھا۔ وہاں ان کے کمرے میں... انہیں اسی کی جیتی جاگتی تصویر کے روپ میں دیکھا!

کراچی میں اپنے تعلیمی دور میں کئی بار فیضؔ صاحب کے عبداللہ ہارون کالج میں تقریری مقابلوں اور مشاعروں کے موقع پر ان سے ملاقات رہی اور کلام بھی سنانے کا موقع ملا لیکن اب کی ملاقات ایک نئے اور مختلف ماحول اور وقت میں ہوئی۔ بہرحال... فیضؔ صاحب نے ہمیں یوں اچانک دیکھ کر حیرت اور مسرت کا اظہار فرمایا، بڑی شفقت سے بٹھایا، ہمارے انہیں Sir کہہ کر مخاطب کرنے پر کہنے لگے: بھئی یہ کالج ہے نہ یونیورسٹی اور نہ ہی آپ کا تعلیمی دور۔

ہم نے عرض کیا: بجا فرمایا آپ نے بیشک یہ کراچی کا، کالج یا یونیورسٹی تو نہیں، البتہ ہمارا تعلیمی دور ہنوز جاری ہے اور پھر ہم نے انہیں بیروت میں اپنی موجودگی کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔

وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: بھئی اب یہاں ہو تو ملتے رہنا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

وہ کراچی کے بھی اہلِ ادب کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرتے رہے۔

پھر یکا یک بولے: بھئی شاعری کیسی جا رہی ہے؟

عرض کیا: بڑے دنوں بعد آج ہی کچھ شعر ہوئے ہیں، اور یہی شعر اِس وقت ہمیں آپ کے پاس لے آئے ہیں۔

اس پر وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں مسکرائے اور فرمایا:

تو ارشاد!۔

ہم ایک دم سٹپٹا سے گئے۔ اور عرض کی: ہم پہلے ہی آپ کا بہت وقت لے چکے ہیں، اگلی بار۔

ہماری بات کو کاٹتے ہوئے فیضؔ صاحب نے فرمایا بھئی: ہم آپ کے شعر ضرور سنیں گے۔

تعمیلِ حکم کے طور پر ہم نے جیب سے پرچہ نکالا اور عرض کیا:

پہلے سینے کے اندھیرے میں چراغاں ٹھہرے
بعد اس کے مرے گھر میں کوئی مہماں ٹھہرے

ہے فصیل اونچی بہت، بند ہے دروازۂ شہر
اب کہاں قافلۂ خانہ بدوشاں ٹھہرے

اپنے اسباب میں، اک بے سر و سامانی تھی
شہر سے دور ہی، ہم بے سر و ساماں ٹھہرے

روح کے چاروں طرف جسم کے ہنگامے ہیں
ایسے پتھراؤ میں کیا، آئینۂ جاں ٹھہرے!
پھر کسی چاک گریباں سے ملے ہیں زلفی
اپنے ہاتھوں میں ذرا، اپنا گریباں ٹھہرے

فیضؔ صاحب نے ہمارے اشعار نہایت توجہ سے سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرما کر ہمت افزائی کی۔ بیروت میں فیضؔ صاحب سے ہماری یہ پہلی ملاقات چار گھنٹوں پر محیط تھی۔ پتا ہی نہ چلا کہ کب دو بج گئے! ہم نے اب اجازت چاہی۔

کہنے لگے: آتے رہنا... اور ہاں آپ کی ابتدائی تعلیم تو عربی ہی میں ہوئی ہے۔ آپ کچھ فلسطینی شعراء کی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ کریں۔

پھر اپنی میز کی دراز سے نکال کر ہمیں محمود درویش کا ۱۹۷۰ء میں ''دارالادب بیروت'' سے شائع ہونے والا ۱۴۹ صفحات پر مشتمل چوتھا شعری مجموعہ ''العصافیر تموت فی الجلیل'' (پرندے جلیل میں، مررہے ہیں) دیا اور فرمایا: اب کی بار گھر آئیں اور کتاب پڑھ کر آئیں۔ ایک آدھ نظم کا پہلے نثری ترجمہ بھی کر لائیں۔ دیکھیں گے۔

یہاں بتاتے چلیں کہ شارع الحمراء ساحلِ سمندر پر ''لوٹس'' میگزین کے دفتر سے ملی ہوئی ایک عمارت کی چھٹی منزل پر دو کمروں کے فلیٹ میں فیضؔ صاحب اور ان کی بیگم ایلسؔ کی رہائش تھی۔ جس کی کھڑکیوں سے باہر دیکھیں تو ہر طرف سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد فیضؔ صاحب کی پسند کا یہ فلیٹ ملا تھا۔

میں یہاں پہلے محمود درویش کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس طور شرقِ اوسط میں اُس وقت کی عمومی صورتِ حال کا احاطہ ہو سکے اور اس صورتِ حال سے فیض صاحب کے فکری اور تخلیقی عمل پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ بھی لیا جا سکے۔

۱۹۴۸ء میں جب محمود درویش ابھی چھ سال کے تھے کہ ان کے خاندان نے اپنے آبائی قصبہ البِر وہ سے لبنان کی جانب ہجرت کی۔ پھر محمود درویش اپنے خاندان کے ساتھ اسرائیل قائم ہونے کے بعد ہی واپس موجودہ اسرائیل میں آ گئے۔ اسرائیل میں محمود درویش کو کبھی بھی اسرائیلی عرب کی حیثیت میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب وہ ماسکو گئے تو اُس وقت تک ان کی شاعری کے چار مجموعے شائع ہو چکے تھے اور اس دوران وہ اسرائیلی جیلوں کی اصلیت سے بھی آگاہ ہو چکے تھے کہ اب ان کی جلاوطنی کی طویل زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ابھی ایک سال ہی بیتا تھا کہ انہیں قاہرہ میں پناہ لینی پڑی اور پھر وہاں سے بیروت منتقل ہونا پڑا۔ جہاں ۱۹۷۸ء میں یاسر عرفات کی ایک مجلس میں فیض صاحب سے ان کی ملاقات کروائی گئی۔ ۱۹۸۲ء میں جب اسرائیلیوں نے بیروت پر حملہ کیا تو جہاں فیض صاحب کو بیروت چھوڑنا پڑا اور وہ ماسکو سدھارے۔ وہاں محمود درویش نے بھی یونان کی راہ لی۔ محمود درویش کی مشہورِ زمانہ طویل نظم ''بیروت پر حملہ'' اسی زمانے کی یادگار ہے۔ محمود درویش وطنِ فلسطین سے اپنی محبت اور کسی عرب دوشیزہ کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کو باہم گڈمڈ کرتے رہتے ہیں۔ ایک ہی نظم میں، بلکہ نظم کے ایک ہی بند میں ان کی محبوبہ کبھی گوشت و پوست کا انسان ہوتی ہے اور کبھی ان کے بچھڑے ہوئے وطن کی سرزمین!

اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ان کی محبوبہ فلسطین کی اُن سب بیٹیوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے، جن میں سے کوئی قہوہ خانوں میں کام کرتی ہے تو کوئی چرواہی بن کر پہاڑوں میں گھومتی ہے اور کوئی اپنے یتیم بچوں کے کپڑے دھو کر سکھانے کے لیے الگنی پر ڈال رہی ہوتی ہے۔ فیضؔ صاحب نے ہمیں محمود درویش کی جو کتاب نظموں کا اردو ترجمہ کرنے کے لیے دی تھی اس میں شامل ایک نظم ''کچھ آنسو بچا لو ماں'' کا ہم نے پہلے نثری ترجمہ کیا:

ماں!
اشکوں کو اپنے رخساروں سے نہ اکھاڑو
یونہی جما رہنے دو
کہ آنسوؤں کی بھی جڑیں ہوتی ہیں
ان آنسوؤں کو آنے والی ہر اُس شام کے لیے
بچا رکھو
جب سڑکیں لاشوں سے پٹ جائیں
اور تمہارے بیٹے کی طرح
مسافروں کو راستہ نہ ملے
اور کچھ آنسو محفوظ کر لو
ان بے وطنوں کے لیے جو پہلے مر چکے ہیں
اور مرنے والے ہیں

فیضؔ صاحب نے نثری ترجمہ پسند فرمایا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ: زلفی

صاحب! ترجمہ میں شاعری کی اوریجنل زبان اور محاوروں کی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ اگر آپ میری کسی نظم کا عربی زبان میں ترجمہ کریں تو، یہ ترجمہ پڑھنے والے کو وہ لطف نہیں آئے گا جو ایک اردو کے قاری کو آتا ہے۔ بہر حال اب آپ اس نثری ترجمہ کو منظوم ترجمہ میں ڈھالیں اور اپنی عربی دانی کے بل پر کوشش کریں کہ اردو یا فارسی کے الفاظ کم سے کم استعمال ہوں۔

اور تب ہی ہم نے العصافیر تموت فی الجلیل سے اپنی منتخب کی ہوئی نظم غریب فی مدینة بعید فیضؔ صاحب کو سنائی:

عندما كنت صغيراً
و جميلاً
و الينا بيع بحارى
الورده جرحاً صارت
و الينا بيع ظلماً
هل تغيّرت كثيراً ؟
تغيّرت كثيراً ما
عندما ترجع كالريح
الى منزلنا
جيهتى حدّقى فى
تجدى الورد نخيلاً
و الينا بيع عرق

تجديني مثلما كنت

صغيراً

و جميلاً.

فیض صاحب نظم سے بہت متاثر ہوئے۔ کہنے لگے :زلفی میاں! ہمیں آپ کی عربی دانی پر رشک آتا ہے کہ آپ نے شہر جدّہ کے ایک عربی اسکول "مدرسة الفلاح" سے محض پرائمری پاس کی ہے لیکن عربوں کی طرح، فرفر عربی بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں جبکہ ہم نے تو عربی میں ماسٹرز کیا ہے... لیکن مولوی مدن جیسی بات کہاں!

فیض صاحب کی اس محبت بھری ستائش پر ہم بیحد شرمائے۔ فیض صاحب جب بھی شفقت آمیز بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہمارا یہی حال ہوتا تھا کہ فیض صاحب اور بیگم ایلس کا احترام ہمیشہ مانع رہتا۔

جب محمود درویش کو پڑھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر دل میں ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوا، لہٰذا ایک روز ہم نے اپنی اس خواہش کا اظہار فیض صاحب سے کیا۔ مزید اپنی اس خواہش کو سہارا دینے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ ان سے بالمشافہ ملاقات، بات چیت اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد یقیناً ان کے کلام کا ترجمہ کرنے میں آسانی بھی ہوجائے گی۔

فیض صاحب نے فرمایا: ہاں ہاں ضرور ملوادیں گے۔ ایسا کریں اگلے اتوار کو آپ ہمارے گھر آجائیں۔ لنچ ہمارے ساتھ کریں۔ میں محمود درویش کو بھی بلا لیتا ہوں۔ بھئی یہ تو بہت اچھا ہوجائے گا کہ آپ براہِ راست ان سے عربی میں بات

کر سکیں گے چونکہ ان کی انگریزی بہت کمزور ہے البتہ فرنچ پر انہیں عبور حاصل ہے۔

محمود درویش عمر میں ہم سے پورے پانچ سال بڑے تھے۔ پورے پانچ سال اس لیے کہ ان کی ولادت جولائی ۱۹۴۲ء کی ہے اور ہماری جولائی ۱۹۴۷ء کی۔ لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی تو مغربی لباس میں ملبوس، کلین شیو، سرخ و سفید رنگت اور بھوری آنکھوں والا، محض ۳۶ سالہ یہ نوجوان اپنی عمر سے بڑا اور بیحد بُردبار لگ رہا تھا!

محمود درویش نے دو شادیاں کیں، اور دونوں کا انجام طلاق پر ہوا۔ پہلی شادی ایک عربی نثر نگار رعنا قبانی سے کی۔ جبکہ ۱۹۸۰ء کے وسط میں دوسری شادی ایک مصری مترجمہ حیاۃ حینی سے ہوئی۔ البتہ کسی بیوی سے بچہ کوئی نہ ہوا۔ دل کے عارضے کا مسلسل شکار رہے اور ہارٹ سرجری کے تین دن بعد ۶۷ برس کی عمر میں ۹ر اگست ۲۰۰۸ء کو ہیوسٹن ٹیکساس، امریکہ میں انتقال ہوا۔ محمود درویش کی شاعری کی تیس اور نثری آٹھ کتابیں شائع ہوئیں۔ فیض صاحب کی طرح محمود درویش کو بھی ۱۹۸۳ء سوویت یونین کی جانب سے لینن پرائز ملا۔ فیض احمد فیض ہی کی طرح محمود درویش کا کلام بھی ریڈیو، ٹی وی اور فلموں میں بہت گایا گیا اور بیحد مقبول ہوا۔

اُن دنوں کچھ لوگ کہتے تھے کہ محمود درویش کی شاعری مزاحمتی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی۔ وہ صرف اختلاف و اعتراض کی شاعری ہے۔ یہی بات جب ہم نے بیروت میں فیض صاحب کی قیام گاہ پر محمود درویش سے پوچھی تو وہ قدرے جذباتی سے ہو گئے اور کہا:

لوگ کچھ بھی کہیں، میرے لیے شاعر ہونے کے ناتے جو چیز اہم ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں اپنا کام کرتا چلا جاؤں، بغیر یہ سوچے کہ میں کس طرح کا شاعر ہوں اور

شاعری میں میرا رتبہ کیا ہے۔ مزاحمت کی شاعری میں جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، وطن کی مدافعت کے مقصد کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے، ایسی قوتوں کے خلاف مدافعت، جو وطن کو اپنے جبر وتسلط میں لانا چاہتی ہیں۔ چنانچہ میں جو کچھ بھی لکھتا ہوں، اس کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس سے ایک ایسا انسان ابھر کے سامنے آئے گا جو مختلف صورتوں اور مختلف لبادوں میں وطن کا دفاع ہی کر رہا ہوتا ہے اور میں ہر اُس طاقت کا مدِّ مقابل ٹھہرتا ہوں جو مجھ سے میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔ زمین میرے لیے محض زمین نہیں ہے۔ درخت محض درخت نہیں ہیں، اور شام کوئی سی شام نہیں ہے۔ اس لیے کہ میں فطرتNature کا شاعر نہیں ہوں۔ میں ایک سرزمین کا شاعر ہوں، وطن کا شاعر ہوں اور میرا اعتراض واحتجاج جُز کی طرف سے کُل کے خلاف نہیں ہے بلکہ ایک قابض ومعاند کے خلاف ہے۔ میں اپنے جیلر سے بات کر لیتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں بولنا چاہتا ہوں اور مسلسل تنہائی سے مجھے وحشت ہوتی ہے اور اگر میں اپنے جیلر کی بیوی سے نفرت نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اُن لوگوں کے ساتھ گھل مِل گیا ہوں۔ اس موقع پر محمود نے چند مصرعے پڑھے:

خليفة فى قفص

بين و صيف و بغا

يقول ما قالا له

كما تقول البغا

(خلیفہ پنجرے کا طوطا ہے۔ کچھ وفاداروں اور کچھ نافرمانوں میں گھرا ہوا۔ وہی کہتا ہے جو اسے پڑھایا جاتا ہے)

ہم دیکھ رہے تھے عربی زبان میں بات کرنے والے محمود درویش کے چہرے پر اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں ایک تکلیف دہ تناؤ سا آ گیا ہے اور فیضؔ صاحب بغیر پلک جھپکائے انہیں گہری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا بات کا رخ بدلتے ہوئے ہم نے محمودؔ کو مبارک باد دی: الاخ محمود! مبارک ہو کہ آپ کو ایفرو ایشیائی مصنفین کی انجمن کی جانب سے ''لوٹس'' ایوارڈ ملا ہے۔

کہنے لگ: مجھے معلوم نہیں کہ میں اِس انعام کا حقدار بھی تھا یا نہیں لیکن یہ جب ملا تو مجھے اچھا لگا۔ اس لیے کہ اس کی بدولت میرے مسئلے کو التفات حاصل ہوا ہے اور میں اپنی راہ پر آگے بڑھتے چلے جانے کی ہمت اپنے اندر پاتا ہوں۔ پھر یہ کہ اِس انعام سے ہمارے گرد کھڑے حصار میں ایک چھوٹا سا دریچہ کھل گیا ہے (عربی میں محمودؔ نے یہاں ''شبَـکـہ'' (کھڑکی) کہا تھا جسے ہم نے ''دریچہ'' لکھا ہے) جس میں سے میری اور میرے ساتھیوں کی آواز افریقی ایشیائی سامعین کی زیادہ تعداد تک پہنچ سکے گی لیکن اِس اعزاز کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں مجھ پر نئی ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا ہے۔

رخصت سے پہلے محمود درویش سے کچھ سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے اپنی نظم ''ہمارے حاکمو!'' سنائی:

تم نے ہماری سرزمین کو قبرستان میں بدل دیا ہے
تم نے ہمارے سروں میں گولیاں بوئی ہیں
اور خوں ریزی کو نظریہ بنایا ہے
ہمارے حاکمو!

کوئی عمل اپنے احتساب کے بغیر مکمل نہیں
تم نے جو کچھ میرے لوگوں کے ساتھ کیا ہے
اس کا حساب ہوگا
بھولنے کا امکان نہیں
وہ سب تاریخ کے ماتھے پر رقم ہے

۱۹۷۷ء میں پاکستان سے نکل کر فیضؔ صاحب پہلے دلّی گئے جہاں مختصر قیام کے بعد ماسکو چلے گئے، جہاں ان کا کافی عرصہ تک قیام رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایفروایشیائی ادیبوں کے ترجمان رسالہ ''لوٹس'' کے صدر دفتر کے مقام کا فیصلہ کافی سوچ بچار کے بعد بیروت کے حق میں ہوا تھا۔

اسی ضمن میں ایک اور بڑا فیصلہ ''لوٹس'' کے مدیرِ اعلیٰ کے عہدہ کے لیے فیض احمد فیضؔ کے حق میں ہوا۔ ایلس فیض کو ان کی سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ اس طرح اوائلِ ۱۹۷۸ء میں یاسر عرفات نے ان دونوں کو بیروت روانہ کر دیا۔ یہاں فیضؔ صاحب کو ''لوٹس میگزین'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ذمہ داریوں کا بھاری حصّہ اٹھانا پڑا۔ جن میں بے شمار دفتری کاغذات، رپورٹوں، دستاویزات، وغیرہ کا تیار کرنا تھا، جس پر بہت زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے نوجوان ادیب و شعراء کی تصنیفات کی نوک پلک درست کرنا، ان کی اصلاح کرنا اور یہ بات خود فیضؔ صاحب نے مجھے بتائی کہ بیشتر انہیں ایسی کمزور تخلیقات از سرِ نو تحریر کرنا ہوتی ہیں تاکہ انہیں رسالہ میں جگہ مل سکے اور یہ سب کچھ کرنے کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، وہ صرف یہی تھا کہ نو آزاد پسماندہ ممالک کے ادیبوں کی اس

صورت میں مدد کرنا فیضؔ صاحب اپنا بین الاقوامی فرض سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ "لوٹس" کو شائع کرنے کے لیے معیاری تخلیقات نہیں ملتی تھیں۔ البتہ ایسی تحریروں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔

ایک اتوار کو اپنے معمول کی ملاقات کے لیے اپنی نوٹ بک سنبھالے ہم فیضؔ صاحب کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خاموش اور متفکر ہیں۔ ہمارے دریافت کرنے پر گویا ہوئے:

"زلفی! بھئی میں کل رات سے سورہ بقرہ کی ایک آیت میں الجھا ہوا ہوں۔"

ہم نے ایک دم ان کی بات پکڑتے ہوئے ازراہ مذاق ہنستے ہوئے کہا:

"شکر ہے فیضؔ صاحب کہ آپ آیت "میں" الجھے ہوئے ہیں۔ آیت "سے" نہیں اُلجھے!"

ہمارا یہ فقرہ سن کر وہ بھی ہنس دیے اور بولے:

"گویا تو آپ بھی ہمیں اللہ کا منکر سمجھتے ہیں!"

ہم نے جلدی سے ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور کہا:

"سر آپ تو سنجیدہ ہوگئے۔ جی فرمایئے۔ آپ کس آیت میں الجھے ہوئے ہیں"

فیضؔ صاحب گویا ہوئے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

وَلَکم فی الارضِ مُستق، و متاع، اِلی حین یعنی: "اور تمہارے لیے زمین مستقر اور متاع ہے ایک خاص وقت تک"۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان زمین سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر اس کا مالک نہیں ہوسکتا۔ اس کا مالک خدا آپ ہے اور اقبالؔ بھی اسی نظریے کے قائل ہیں۔ زلفی! میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔

پنجاب کے ایک پیر صاحب نے اقبالؔ سے ایک درخواست لکھ دینے کی فرمائش کی، ہوا یوں تھا کہ اُن دنوں سرکار کی طرف سے لوگوں میں زمین تقسیم ہو رہی تھی اور پیر صاحب چاہتے تھے کہ زمین کا ایک آدھ قطعہ انہیں بھی مل جائے۔ اقبالؔ نے کہا کہ درخواست تو میں لکھے دیتا ہوں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ درخواست پیش کس کے سامنے کرنا ہوگی؟ پیر صاحب اس بات کو کیا سمجھتے،، خاموش ہو رہے۔ پھر اقبالؔ نے خود ہی کہا کہ پیر صاحب! ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے۔ اس کتاب کو خدا نے اپنے آخری نبی پر اتارا جن کا نام محمد ﷺ تھا۔ یہ نبی عرب کے رہنے والے تھے۔ ان کی وفات کو تیرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو میں درخوست خدا کے نام لکھ دوں۔

فیضؔ صاحب نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا۔

اقبالؔ کو میں مسلم سوشلسٹ کہتا ہوں کیونکہ وہ زمین کے معاملے میں قومی ملکیت کے قائل ہیں۔ کاشتکار سے ملت کا خزانۂ عامرہ تو بجا طور پر پیداوار کا کچھ حصہ طلب کر سکتا ہے لیکن کسی ناکردہ مالک کا اس پر کوئی حق نہیں۔

ہم نے عرض کی بجا فرمایا آپ نے۔ لیکن فیضؔ صاحب یہ تو فرمائیں کہ علامہ اقبالؔ سے آپ کا عشق کتنا پرانا ہے؟

فیضؔ صاحب مسکرائے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے گویا ہوئے:

بھئی یہ غالباً ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ اُس وقت ہم یہی کوئی چھ سات سال کے تھے جب ہم نے پہلی بار انہیں سیالکوٹ میں انجمن اسلامیہ اسکول کے ایک جلسہ میں دیکھا تھا۔ ہمیں اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لیے دیا گیا تھا کہ ہمیں قرآت

سنانی تھی۔ لہٰذا کسی نے ہمیں باقاعدہ اٹھا کر علامہ اقبالؔ کے سامنے رکھی ہوئی میز پر کھڑا کر دیا تھا کہ اب تلاوت کرو۔ اس کے بعد تو ہمیں ان سے کئی بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہمارے ہم وطن تھے۔ دوسرے ہمارے والد بیرسٹر سلطان محمد خاں جو لندن میں افغانستان کے سفیر بھی تھے۔ ان کے دوست بھی تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؔ بھی لندن میں ہوتے تھے۔ پھر ۱۹۳۳ء میں جب ہم گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگریزی کے طالب علم تھے۔ تو ہم نے کالج کے میگزین راویؔ کے لیے اقبالؔ پر ایک نظم کہی تھی۔ جواب ہماری کسی کتاب میں بھی شامل نہیں ہے لیکن ہماری یہ نظم اُس دور کے طالب علموں میں اس قدر مقبول ہوئی کہ مختلف موقعوں پر بار بار سنی گئی۔ اس لیے ہمیں بھی حفظ ہو گئی تھی۔

فیضؔ صاحب کے منہ سے یہ بات سن کر ہم نے نہایت تجسس کے ساتھ ان سے درخواست کی کہ پلیز آپ اپنی یادداشت پر زور دے کر ہمیں وہ نظم ضرور سنائیں۔

فیضؔ صاحب نے اپنے مخصوص صوفے پر پہلو بدلا۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں ماتھے پر پھیریں اور ۴۵ سال قبل کہی ہوئی نظم سنانا شروع کر دی:

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ یزداں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں
سنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی
''عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا''

فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے

ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے
فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں

زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کُن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

فیضؔ صاحب کی نظم سن کر ہم ایک دم ان سے پوچھ بیٹھے: جب آپ اقبالؔ کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے تو آپ نے ان کا رنگ کیوں اختیار نہیں کیا؟

فیضؔ صاحب نے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے فرمایا: ''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری شاعری میں اقبالؔ کا رنگ نہیں ہے! بنیادی طور پر میں نے ان کا رنگ قبول کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اُن کا اسلوب الگ ہے اور میرا طرزِ بیان دوسرا لیکن جہاں تک انسان دوستی، انسان کی عظمت، عدل و انصاف، استحصال کا خاتمہ، ظلم و جبر کے خلاف احتجاج۔ یہ سب ان ہی کی تعلیمات کا اثر ہے۔

فیضؔ صاحب کی باتیں سن کر مجھے اقبالؔ اور فیضؔ کے درمیان وہ ذہنی قربت اور مماثلت نظر آئی کہ ان دونوں کے درمیان فرقِ مراتب کا احساس جاتا رہا کہ یہ فرقِ مراتب درِ سیاست کے کسی خاص نظام سے فیض یاب ہونے یا تعلیم و تربیت کا نہیں بلکہ ان منفرد اور خاص الخاص تخلیقی صلاحیتوں کا ہے جو بندوں کے لیے خدائے بخشندہ کا عطیہ ہوتی ہیں اور کسی درس اور کسی تعلیم و تربیت اور کسی محنت و مشقت سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ اقبالؔ جیسے دل و دماغ اور فیضؔ جیسی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کا دردمند آدمی تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ فیضؔ کی دردمندی اشتراکیت کی مرہونِ منت نہیں۔ یہ ان کی فطرت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی وابستگی کے نتیجے میں کچلی ہوئی انسانیت کا غم کرنے سے پیشتر ہی یہ ان کی رومانی افسردگی میں جھلکتی تھی، چنانچہ اس کا

اظہار'' دلے بفرد ختم، جانے خریدم، سے قبل ان کی رومانی نظموں میں ملتا ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کہ اشتراکی نظریے سے وابستگی نے ان کے جذبۂ دردمندی کو تیز کیا۔ جیسا کہ ان کی منظومات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی دردمندی ذاتی بھی ہے، اور اجتماعی بھی۔ یہ عصری صورتِ حال کی پیدا کردہ ہے اور انسانیت کی صدیوں کی مظلومیت سے بھی ہم رشتہ ہے۔ یہ ملکی حالات کی زائیدہ بھی ہے اور بین الاقوامی سطح پر انسانی صورتِ حال کا پتا بھی دیتی ہے۔ اس لیے یہ وسیع تر انسانی دردمندی پر منتج ہوتی ہے اور ان کے نشاطیہ روّیے کے باوجود دل کو کچوکے لگاتی ہے۔ یہ دردمندی وجودی سطح پر جدید انسان کی بے چارگی، تنہائی اور اجنبیت کا احساس دلاتی ہے۔

گرانیِ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے
علاجِ درد، ترے درد مند کیا کرتے
کب ٹھہرے گا دردِ اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

فیضؔ کی زندگی میں ''نجاتِ دیدہ و دل'' کی چند گھڑیاں ضرور آئیں ہیں، ان گھڑیوں میں انہوں نے ذہن کی اُس روشنی کو پالیا تھا جو توانائی کی غیر استدلالی شدّت سے پیوستہ ہے۔ انہوں نے عصری آگہی کے کرب کا احساس کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عصری آگہی کا ایک ایسا ایمائی اظہار کیا ہے جو معاصر سیاسی یا سماجی قوتوں کی آویزش کو خیر و شر کی ازلی کشمکش میں تبدیل کرتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا یہی پہلو ہے جو انہیں معاصرت کی سطح سے بلند کر کے نئے دور کی شکست خوردہ نسلوں کے قریب کرتا ہے۔ ایسے ہی اشعار ان کا سرمایۂ حیات اور ان کی انفرادیت کے ضامن ہیں۔

رہے ان کے وہ اشعار جو رومانی، سماجی یا عشقیہ تصورات پر محیط ہیں اور شعری تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ وہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر دلالت تو کرتے ہیں لیکن ان کو وہ ہمہ گیریت عطا نہیں کر سکتے جو میرؔ و غالبؔ کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنی امکانی حدود کے اسیر ہیں۔

بیروت میں قیام کے دوران دو سال کے عرصہ میں فیضؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے صوفیانہ اوصاف سے اپنی عملی زندگی کو سنوارنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ فیضؔ صاحب میں بے پناہ قوتِ برداشت تھی۔ اس پر دنیا سے بے نیازی کی ایک انوکھی شان تھی۔ ان کی درویش صفتی کا یہ عالم تھا کہ جب عبداللہ ہارون کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا تو ڈاکٹر نصرت ہارون، فیضؔ صاحب کے گھر، ہارون ٹرسٹ کی طرف سے ان کا مشاہرہ طے کرنے کے لیے گئیں۔ بار باران سے درخواست کی کہ ہارون کالج کے پرنسپل کی تنخواہ ٹرسٹ والوں نے تین ہزار روپے ماہانہ مقرر کی ہے۔ ہمیں آپ کو اتنی تنخواہ ہی دینا پڑے گی۔ فیضؔ صاحب بضد تھے وہ اتنی تنخواہ لے کر کیا کریں گے۔ انھوں نے نصرت ہارون سے صرف بارہ سو روپے مانگے۔ اس پر نصرت نے کہا اٹھارہ سو روپے سے کم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا فیضؔ صاحب نے بہ حالتِ مجبوری کہ اٹھارہ سو روپے سے کم نہیں ہو سکتے۔ یہ مشاہرہ قبول کیا! اسی طرح بے خوفی کی مجاہدانہ شان بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس ضمن میں بھی ہم ایک واقعہ سناتے چلیں۔ بیروت میں اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد جولائی ۱۹۸۰ء میں ہم سعودی عربیہ واپس، سعودی ائر لائنز میں اپنی ملازمت پر چلے گئے لیکن اب چونکہ دو سال کے عرصہ میں فیضؔ صاحب سے ملاقات اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی

عادت سی پڑ گئی تھی۔ لہٰذا اپنی ائر لائنز کی ملازمت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ ہم بالعموم ویک اینڈ پر بیروت کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ یہ ۱۹۸۲ء کی بات ہے جب اسرائیلیوں نے باقاعدہ بیروت پر حملوں کا آغاز کیا۔ یہ بات ہمیں بیگم فیض نے بتائی کہ ایک رات بمباری کے دوران ان کے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ جب ایلس نے انہیں جگا کر اس خوفناک صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ یہ کہہ کر کروٹ بدل کر سو گئے کہ ''اچھا صبح دیکھیں گے'' بے خوفی اور بے نیازی کی یہ والہانہ ادا ان کے وجود میں ایک گہرے مجاہدے کا پتا دیتی ہے۔ ایک مجاہدہ اور مراقبہ آدمی کے لہو میں خود بخود مصروفِ عمل رہتا ہے۔

سعودی ائر لائنز میں بیس سالہ ملازمت کے دوران اپنے فرائضِ منصبی کی بجا آوری کے لیے ہمارا دنیا بھر کے ان تمام ممالک میں (جہاں ہماری ائر لائنز جاتی ہے) قائم اپنے اسٹیشنوں پر جانا لگا رہتا تھا۔ لہٰذا اس دوران وہاں کے تاریخی، ثقافتی، سماجی، علمی، ادبی، فنّی اور سیاسی مظاہر کا اپنے زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیا اور ان ممالک کے مشہور اور اہم شہروں پر مختصر مگر جامع ''سیاحی نظمیں'' لکھیں جو ''آگرہ سے نیاگرہ'' کے نام سے میرے کینیڈا منتقل ہونے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئیں تھیں۔ اسی سلسلے میں ہم نے بیروت پر بھی ایک نظم کہنا شروع کی۔ گو ہمارا بیروت کا چکر تو ۱۹۷۰ء سے ہی لگنا شروع ہو گیا تھا۔ اس دوران بقول شخصے ہم نے بیروت کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ وہ اچھے دن تھے۔ جنگ کا طبل ابھی نہیں بجا تھا۔ بیروت کی رنگینیاں اپنے عروج پر تھیں۔ اُس زمانے میں ساری عرب دنیا کے شیوخ بیروت ہی کا کلمہ پڑھتے تھے۔ خیر۔ ہم نے بھی ۱۹۷۸ء میں بیروت پر سیاحی نظم کہنا شروع کی۔

ایک دن فیضؔ صاحب کے پوچھنے پر کہ ''بھئی آج کل صرف پڑھائی ہو رہی ہے یا شعروریر بھی ہورہے ہیں'' ہم نے انہیں، بیروت پر کہی اپنی یہ نظم سنائی:

تختہ ہائے سبزہ و گُل ہیں قطار اندر قطار
ان شجر ہائے بلوط و سَرو پہ دائم بہار
اک عجوبۂ زمانہ بعلبکؔ کے یہ کھنڈر
قومِ پیگنؔ کے یہ معبد اور مقدس بام و در
شارعِ حمؔراء پہ ڈھایا نوجوانوں نے غضب
مہوشوں سے جب ہوئے سینہ بہ سینہ لب بہ لب
کم سِنوں کی کیبرے کے رقص میں بے باکیاں
وہ تھرکتے زاویے وہ جھانکتی گولائیاں
جلتی بجھتی روشنی کے رنگ، یہ ڈسکو کا شور
نوجواں جوڑوں کی سنگت اور جوانی کا وہ زور

نوٹ: یہ نظم ۱۹۸۲ء میں درج ذیل دو شعروں کے ساتھ مکمل ہوئی تھی۔

اب جو رُت بدلی تو ویراں ہوگئے سارے مقام
موت رقصاں، رنگ دھندلے، گھر کھنڈر، بے کیف شام
مِل گئی بے رہروی کی دیکھئے آخر سزا
شام ہے شامِ غریباں، صبح، صبحِ کربلا

نظم سنے کے بعد فیضؔ صاحب گویا ہوئے: ''بھئی نظم کی اٹھان تو اچھی ہے۔ جب مکمل ہوجائے تو ہمیں ضرور سنایئے گا لیکن اِس نظم میں آپ نے جن

مقامات کا ذکر کیا ہے اور نقشہ کھینچا ہے۔تو کبھی ہمیں بھی ان کی سیر کروائیں!"

ہم نے عرض کی۔ارے فیضؔ صاحب آپ جب حکم فرمائیں، ہم آپ کو ایک ایک کر کے دکھادیں گے یہ سب جگہیں۔

کہنے لگے: پھر اگلے اتوار کو چلتے ہیں۔

ہم نے عرض کی۔سر! اگلے ویک اینڈ پر تو میں دو دن کی اضافی چھٹی لے کر فیملی سے ملنے جدّہ جارہا ہوں۔اُس کے بعد کا اتوار ٹھیک رہے گا۔

پاکستان میں فیضؔ صاحب بہت لیے دیئے رہنے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ان کی شاعری کا ایک وصف "ایک قسم کی خود ضبطی" تھی لیکن وہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی جذباتیت کا بھی شکار ہو جاتے تھے۔مثلاً ان کی مشہور غزل:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ہم دیکھتے ہیں کہ اس غزل میں جذبہ نہیں جذباتیت ہے۔شاعرانہ وجدان قاری کی قوتِ تخیل اور جذبے، دونوں پر سحر طاری کرتا ہے۔شاعری کا وہ مواد جو آواز اور امیجری کی صورت اختیار کرتا ہے، وہ پورا آدمی ہے جو سوچتا ہے، ارادہ کرتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے۔جو طاقت ور بھی ہے اور کمزور بھی، عظیم بھی ہے، ستم رسیدہ بھی، اچھا بھی، برا بھی۔وہ آدمی جو زندگی کی خوشیوں اور غموں میں جا پھنسا ہے، جو عجیب مٹھاس اور نرمی سے ہیجانات، خواہشات، ترکِ دنیا اور اثباتِ حیات کے درمیان پارہ پارہ ہے اور زندگی سے اس قدر بندھا ہوا کہ جانتا ہے شاعری کیا ہے اور اس کی مسرت کیا ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں کیسے شریک ہوا جا سکتا ہے۔وہ یہ

بھی جانتا ہے کہ یہ خوشی کیسے وجود میں آتی ہے اور کس طرح درد سے ہمکنار ہوتی ہے۔ دراصل وہ اپنی کامل ہیئت سے حُسن پیدا کرنے والی خوشی حاصل کرتا ہے۔ بلاشبہ فیضؔ کے اندر بھی ایک ایسا پورا انسان موجود تھا جو تلخیوں کے سمندر میں پیرنے کے باوجود قطرہ قطرہ مسرت اور حُسن کشید کرسکتا تھا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ساعتِ بے زار کے رنگوں کو راحتِ دیدار کے رنگ سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے لذّت اورالم کے وسیع تر نظریے پر اپنے شعری قصر کی بنیاد رکھی ہے اور اس کی آرائش کے لیے چمپئی پھولوں، سرمئی لمحوں، زرد پتوں، سرخ کلیوں، تاریک راتوں اور سبز ساعتوں کا انتخاب کیا ہے۔ فیضؔ کے مزاج کی آسائش، ملائمت اور خواب کی کیفیت، ضبط کا نشہ، پھولوں اور موسموں سے محبت، خوبصورت چہروں کی دل افروزی اور خالص رومانوی معیارِ حیات۔ ان سب چیزوں نے مِل کر ان کی شخصیت اور شاعری کو منفرد، خوابناک اور رنگین بنادیا ہے۔ اپنی اسی تنوع پسندی کے باعث وہ جدید نسل کے واحد خوش قسمت شاعر ہیں جس سے قدیم طرزِ سخن کے شعراء بھی خوش ہیں اور نئی نسل کے جدید یئے بھی مطمئن۔ انہوں نے انقلاب اور ترقی پسندی کے نعروں کو وہ شعری نزاکتیں بخشی ہیں جو ان سے پہلے کم از کم اردو ادب میں موجود نہ تھیں۔ ایک طرف ان کی شاعری کے رنگ اشتراکی و انقلابی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان سے ایک ایسی فضاء ترتیب پاتی ہے جو خالصتاً فیضؔ کی اپنی فضاء ہے۔

آخر وہ دن آہی گیا جس کا انتظار ہم فیضؔ صاحب سے بیروت میں اپنی پہلی ملاقات سے کررہے تھے۔ معمول کے مطابق جب ہم اتوار کے دن اُن کے فلیٹ پر پہنچے تو انہیں اپنی ایک تازہ مکمل کی ہوئی نظم کو Fair کرتے ہوئے پایا۔ انہوں نے

سر اٹھا کر ہمیں دیکھتے ہوئے کہا:

آئیں بھئی بیٹھیں۔

ہم سلام کر کے صوفے پر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنے کام سے فارغ ہوئے اور Rough پیپر کو مٹھی میں مروڑ کر کونے میں رکھی ہوئی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے فرمایا:

اور بھئی کیا حال چال ہیں۔ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔

ہم نے کہا فرسٹ کلاس سر!

اور پھر تجسس سے پوچھا: کیا ہو رہا ہے فیضؔ صاحب!

بولے: بھئی کافی دنوں سے ایک نظم لکھی رکھی تھی، آپ اسے ''نذرِ غالبؔ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ پچھلے ہفتے جب لندن گئے تھے وہیں مکمل کی تھی لیکن اسے Fair کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، بس وہی لکھ رہے تھے۔

ہمیں جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ ابھی جو کاغذ فیضؔ صاحب نے مروڑ کر ٹوکری میں پھینکا ہے وہ ان کی تازہ نظم رف فارم میں تھی تو ہم نے لپک کر ٹوکری سے اسے نکالا اور اپنی نوٹ بک پر پھیلا کر سیدھا کرنے کے بعد حفاظت سے اندر رکھ لیا۔ اس دوران فیضؔ صاحب اپنی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتے رہے۔

پھر گویا ہوئے: ارے بھئی۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔ آخر وہ کٹی پھٹی نظم آپ کے کس کام کی!

ہم نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے۔ صرف اتنا کہا: حضور! آپ کی کٹی پھٹی نظم ہمارے لیے کسی مرقع سے کم نہیں۔

فیضؔ صاحب چونکہ اُس وقت خوشگوار موڈ میں تھے اور اُن پر سرشاری کی وہی کیفیت طاری تھی جو کسی بھی فنکار کی اپنے فن پارے کی اطمینان بخش تکمیل پر ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے پہلی بار فیضؔ صاحب سے درخواست کی، کیا ہمیں اس نظم کو سب سے پہلے سننے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے!

فیضؔ صاحب نے اپنی طمانیت بھرے چہرے پر شفیق مسکراہٹ کو مزید گہرا کرتے ہوئے۔ نیا سگریٹ سلگایا۔ نظم کا عنوان ''دلِ من مسافرِ من'' بتا کر... گویا ہوئے:

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر، کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا

کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھ کر میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا جیسے تمام سکون و اطمینان ان کے جسم و ذہن میں سمٹ آیا ہے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو اپنے چہرے پر نہیں ظاہر ہونے دیتے تھے لیکن آج نظم ختم کرنے کے بعد ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ فیضؔ صاحب کچھ اداس، مضطرب اور بکھرے بکھرے سے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ وہ جب ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو انہیں تنہائی چاہیئے ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نے ان سے اجازت چاہی اور اپنے یونیورسٹی کیمپس کا رخ کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ہم نے نوٹ بک سے فیضؔ صاحب کی نظم نکال کر اسے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ دیکھا کہ فیضؔ نے جلاوطنی کی وطنیہ شاعری میں ہجر کی اذیت ناک کیفیات کے زیرِ اثر اپنے لب و لہجے کو تو بدلا ہے لیکن شعر کی صورت نہیں بدلی۔ اس نظم میں کئی تصرفات بھی ہیں۔ کچھ ہیئت کا تجربہ بھی ہے لیکن بڑی حد تک قافیہ بند شاعری کی حدود میں رہتے ہوئے۔ الفاظ کی کفایت بھی ہے اور خیال کا ارتقاء بھی۔ ردیف و قافیہ اور صوت و آہنگ کے لیے مستند بحر بھی ہے۔ نظم سنانے کے

بعد فیضؔ صاحب ڈیپریشن کی جس شدید کیفیت میں مبتلا ہو گئے تھے، اسے دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ جلا وطنی کے ان اذیت ناک دنوں کو کاٹنے کے لیے فیضؔ صاحب نے اچھا کیا کہ خود کو کسی نہ کسی کام سے منسلک ہی رکھا۔ پہلے تو یہ کہ ان کی نظر سے قومی مسائل بھی اوجھل نہیں ہوئے۔ پاکستان کی فضاء میں ایک توازن کی تلاش اور طلب جاری رہی۔ دوسرے یہ کہ ان کا شغف ایشیاء اور افریقہ کی ادبی اور تہذیبی تحریکوں سے بڑھ گیا۔ تیسرے یہ کہ یونیسکو نے ان کی شاعری کے توسط سے جدید اردو شاعری کو مغرب سے متعارف کروایا اور آخری بات یہ کہ وہ تحریکِ فلسطین سے منسلک رہے اور فلسطینی کاز کو تقویت پہنچانے کے لیے کام کیا اور یہ سب کچھ انہوں نے ''لوٹس'' کی ادارت کے زمانے میں کیا۔ واضح رہے کہ انہوں نے کئی زبانوں کی فکر کو اس رسالہ میں اکٹھا بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قیامِ بیروت ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران انہیں تواتر کے ساتھ دہلی، ماسکو، شام، عراق، مصر، الجزائر، جاپان، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ بھی بلایا گیا۔

فیض احمد فیضؔ کی اسی اہمیت، مقبولیت اور پزیرائی کو دیکھ کر ان کے بعض حاسد معاصرین کے، ترقی پسند تحریک کے مخالفین اور اسٹیبلشمنٹ کے پیش کردہ نظریۂ پاکستان کے بعض وکیلوں کے فتویٰ نما تبصرے سامنے آتے رہے۔ فیضؔ صاحب کے ساتھ تو یہ بھی مشکل ہے کہ اپنی شاعری کی ابتداء کے ساتھ ہی انہوں نے جن نظریات و افکار کو اپنایا، مرتے دم تک ان میں نہ تبدیلی آئی، نہ انہوں نے اس میں کوئی ترمیم کی۔ ان نظریات و افکار کے بغیر ان کی شاعری اور شخصیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فیضؔ کے مخالفین اور الجھنوں میں مبتلا لوگ غالبؔ ہی کا رویّہ اپنا لیتے تو بات بن سکتی تھی کہ وہ

فیضؔ صاحب کی وفاداری بشرطِ استواری کو ہی اصلِ ایمان قرار دے سکتے تھے مگر اس کے لیے تو بڑے ظرف کی ضرورت ہے۔ فیضؔ صاحب کی شاعری میں جو حسن ہے جو شعریت ہے۔ شاعری کی دیوی Muse جس طرح ان پر مہربان تھی، اس کا تو سب ذکر کرتے ہیں لیکن ان کی خوبصورت ترین شاعری اور ان کے بھرپور دلوں میں اتر جانے والے لہجے کے ساتھ فیضؔ کی شاعری کا یہ بھی حسن ہے کہ وہ دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے شاعر تھے۔ اس عقیدے اور مسلک کے حوالے سے انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔ ان کی زندگی اور جدوجہد شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے اپنے مسلک کے لیے بڑی بڑی صعوبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ پھر ان کا ڈھنڈورا بھی نہ پیٹا۔ ہیرو بننے کی بھی کوشش نہ کی کیونکہ وہ تو تھے ہی ہیرو۔ اقبالؔ کے بعد اردو شاعری کے افق پر جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ کا بھرپور انداز میں ظہور ہوتا ہے۔ پھر ن۔م۔راشد ہیں جن کے اردو شاعری پر گہرے اثرات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

راشدؔ کے ہاں جو عمق اور فکری گہرائی اور شعری کرافٹ ہے۔ اس نے انہیں بڑی شاعری کا خالق بنایا ہے لیکن اپنی تمام تر بڑائی کے باوجود راشد۔ بین الاقوامی شہرت اور مقام حاصل نہ کر سکے۔ جوشؔ صاحب اور فراقؔ صاحب کا اردو شاعری میں جو مقام ہے اس سے بھی کوئی منکر نہیں ہو سکتا لیکن فراقؔ اور جوشؔ بھی عالمی شہرت حاصل نہ کر سکے۔ فیضؔ بطور انسان اور بحیثیت شاعر۔ میرے نزدیک جہاں نیشنلسٹ بھی تھے وہاں انٹرنیشنلسٹ بھی تھے۔ ژئیس، لوئی آراگان، ۱ذرا پنڈ، ٹی۔ ایس ایلیٹ، رابرٹ فراسٹ، کارل سینڈ برگ، لورکا، پاسترناک، ڈلن تھامس اور ناظم

حکمت کا فیضؔ صاحب کی رحلت سے بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ سینگال کے سینگھور اور چلی کے پابلو نرودا، جو شہرت اور نظریاتی مسلک کے اعتبار سے فیضؔ کے ''حریف'' قرار دیئے جا سکتے تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اپنی شاعری کے آفاقی تناظر، انسان دوستی، محبت اور بین الاقوامی مقبولیت کے اعتبار سے فیضؔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے زندہ شاعر تھے۔ فیضؔ صاحب کی شاعری مشاہدے، حسن اور تخلیقی سوزِ دروں کی شاعری ہے۔ اس شاعری میں وہ حسن ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فیضؔ پوری انسانیت اور پوری دنیا کے شاعر تھے۔

یہ فیضؔ کی سخت جانی اور ظرف کا کمال تھا کہ وہ چٹخے نہیں، تڑخے نہیں۔ ورنہ فیضؔ کو تو ہم سن اکاون ہی میں کھا کے ہضم کر چکے ہوتے۔ زنداں نصیب شاعر کو ان بیڑیوں سے، پسِ مرگ فیضؔ نوازیوں یا اسکرین آمیز محبتوں نے نہیں نکالا بلکہ ان کو جو محبت انسانیت سے تھی۔ یہ اس کا طفیل ہے کہ وہ مر کے جی اٹھے۔ ان کی زندگی ہنگاموں سے پُر تھی مگر وہ جینے کے ہاتھوں مرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ موت کی کوکھ سے زندگی نمودار کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ یہ میرا بیروت کے زمانے کا مشاہدہ ہے کہ فیضؔ صاحب بڑے ٹھنڈے میٹھے آدمی تھے۔ غصہ ان کو بالکل ہی نہیں آتا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ کسی نے انہیں غیظ میں نہیں دیکھا۔ یاروں نے کیسے تیر ان پر نہ چھوڑے۔ کس کس گالی سے ان کو نہیں نوازا مگر یہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نہ گالی، نہ غصہ، نہ اشتعال۔ وہی محبت و مروّت میں لپٹی، انکسار و اختصار میں رنگی بے غرض و بے لوث مسکراہٹ ہر انسانی چہرے پر چھڑک رہے ہیں۔

تازہ نظم سنائی جانے والی ملاقات کے چند روز بعد جب ہم نے فیضؔ صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے لیے انہیں فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے میڈیکل چیک اپ کے سلسلے میں تین چار ہفتے کے لیے لندن جا رہے ہیں۔

فیضؔ صاحب کی لندن سے واپسی پر ہم چھٹی کے دن ان سے ملنے گئے۔ دیکھا کافی حد تک تازہ دم ہیں۔ چہرے پر قدرے بحالی ہے۔ سکون ہے۔ اور یہ یقیناً ماحول۔ آب وہوا۔ اور معمولاتِ زندگی میں تبدیلی کی دین تھی۔

لندن میں میڈیکل چیک اپ کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد۔ خود ہی گویا ہوئے: بھئی ایک نظم کہی ہے۔ لندن میں تو سب کو سنا آئے۔ اب آپ کو کیوں محروم رکھیں۔

فیضؔ صاحب کے منہ سے ان کے تازہ کلام کا سن کر۔ ہم تو پھڑک اٹھے۔ جلدی سے اپنی نوٹ بک اور قلم سنبھالا اور عرض کیا۔ عطاء ہو!

ہم جتنے بیتاب تھے۔ فیضؔ صاحب نے اس سے زیادہ تحمل سے اپنی نظم ''کوئی عاشق کسی محبوبہ سے'' سنانی شروع کی:

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا
گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو
اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو
اور جو نہ چاہو نہ کہو

نظم سنانے کے بعد فیضؔ صاحب تو حسب عادت اپنی سماعت اور گویائی کا ''سوئچ آف'' کر کے ''غائب'' ہو گئے۔

ہم سوچنے لگے کہ فیضؔ کے کلام کا سننا یا پڑھنا، ہمیں اُس دور کے عمومی عصری رجحانات کی طرف لے جاتا ہے اور ایک نصف صدی، اہم تخلیقی ادب کی ارتقائی منزلوں کے لیے کوئی طویل مدت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اردو ہو یا کوئی اور ایشیائی زبان ہو، تخلیق و تحقیق کے لیے نصف صدی کے اندر تین نسلوں کے اہم کام کی جڑیں

ملتی ہیں۔ فیضؔ کی ایک نظم ''سوچنے دو'' روسی شاعر وزینسن سکی کے نام ہے، جواُن سے ۲۲ سال چھوٹے ہیں لیکن ان سے پہلے بھی ایک قدآور نسل تھی۔ اقبالؔ، حسرتؔ، جوشؔ وفراقؔ کی نسل۔ فیضؔ نے اس نسل کا احترام کیا۔ اسی طرح ان کے بعد آنے والی نسل نے ان کو ہمیشہ محترم سمجھا اور وہ نسل ان کو قمچیاں مارنے والی نسل نہیں تھی۔ نہ اس نسل میں ان کی تخلیقی، معیاری، تہذیبی سطح کے ادراک کی کمی تھی۔ شاید اس احترام کا ثبوت ان تک پہنچ چکا تھا۔ بہرکیف تخلیق کا سلسلہ کسی ایک منزل پر نہیں رکتا، ہر دور کے تخلیقی ادب میں مواد اور ہئیت کا تغیر گذشتہ دور کے کسی قدر فنی اور فکری انحراف احساسات کی ایک دوسری نوع کی سمت ضرور آجاتی ہے جس کی تہہ میں روایات کا تسلسل بھی کارفرما ملتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری کا ایک اہم باب عرب اسرائیل جنگ۔ برسوں کی جلاوطن فلسطینی آبادی کی ایک آزاد ریاست قائم کرنے کی تحریک سے تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے قیامِ بیروت کے دوران کی شاعری ''مرے دل مرے مسافر'' کو قائدِ تحریکِ فلسطین ابوعمار یاسر عرفات سے منسوب کیا ہے۔

اپنے قیامِ بیروت کے عرصہ میں، اپنی تعلیمی مصروفیت کے ساتھ ساتھ فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھ کر، ان کے افکار سننے اور ان کی تخلیقی صلاحیت کی کارکردگی، ان کے اسلوب ولفظیات کی اندورونی ساخت اور ان کی شعری فکر کی معنویت کو سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ کسی بھی شاعر کے کلام میں ان عناصر کے تجسس میں اگر ہمیں مثبت اور متحرک اجزا ملیں تو صرف یہی نہیں کہ قبولیت کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں بلکہ اس کے کلام کی بنیادی حیثیت بھی یہ ہوجاتی ہے کہ اس نے سوچ کے ایک نئے موڑ پر اضطراری، ہیجانی اور تشنج آمیز کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنی تاریخ اور روایات سے

مسلک فکر کو آ گے بڑھا رہا ہے۔اس کی آ گہی عہدِ حاضر میں اپنی ضرورتوں کا پاس کرتی ہے، جس کے بغیر فرد اور معاشرے کی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔اسی طرح تغیرات سے پیوستہ۔اس کی ابیات۔ایک طرف اپنے ورثے کا حصہ ہیں اور دوسری طرف فکرِ نو کا اشارہ ہیں۔فیضؔ کے کلام میں یہ خوبیاں اسی طرح موجود ہیں جیسے ایک شجر کی زندگی میں اس کا عہد نمو ہوتا ہے۔فیضؔ نے تیسری دھائی میں کہا تھا۔غلامی "اپنے اجداد کی میراث ہے مجبور ہیں ہم" اُس دور سے پانچ سال بعد تک ان کے شعری تجربوں کی کئی منزلیں ملیں گی لیکن ان کی خوش کلامی کی نمو پروری اپنی تاریخ بدلتی ہوئی دنیا۔اپنی روایات کے اندر جاری رہی۔ان مسائل پر گفتگو بار بار نکلتی ہے لیکن ان کے دور کی شعری نفسیات کے بدل جانے کی وجہ سے، ان کی شاعری میں روایت کا دخل پورے سیاق وسباق سے سامنے نہیں آتا ہے۔اسے سمجھانے کی ضرورت ہے اور جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا مجھے اپنے قیامِ بیروت کے دوران براہِ راست۔اسے فیضؔ صاحب کی زبانی سمجھنے کا موقع ملا۔یہ سلسلہ میری ماسٹرز کی تعلیم مکمل ہونے اور سعودی عربیہ واپس چلے جانے کے بعد بھی وقفے وقفے سے جاری رہا۔وہ اس طرح کہ اپنی ائرلائنز کی ملازمت اور اپنی منصبی ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے بیروت کے متعدد پھیرے لگانے کے دوران ۱۹۸۲ء تک جب جب فیضؔ صاحب مجھے بیروت میں ملے۔اپنی "نوٹ بک" کے ساتھ ضرور ان سے ملاقات کی اور ہر مرتبہ ان کی فکر اور تخلیقی ہنر کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو میرے سامنے آیا۔

اسی طرح ۱۹۸۰ء بیروت میں کہی جانے والی فیضؔ صاحب کی نظم "میرے ملنے والے" کے حوالے سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے جب یہ نظم کہی

تو، بیروت میں ان کے مداحوں میں اِس ''اکلوتے ہم وطن مداح'' کو سب سے پہلے یہ نظم سننے کا اعزاز حاصل ہے:

وہ در کھلا میرے غمکدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرشِ افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو مٹانے
وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے
یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
یہ کون آیا، کب گیا ہے
نگاہوں کو خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزاروں وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

فیضؔ صاحب کم گو، نفاست پسند اور عالی دماغ انسان تھے۔ لفظوں کے جوہری، فکری کمال اور لسانی جمال کے تاجدار، غزل کے بادشاہ، فکر میں روایت شکن، لفظوں میں روایت پسند، لفظوں سے ایسی وضع داری اور یاری نبھائی کہ ان کی قدر، مقدور اور نصیبہ بدل گیا۔ غالبؔ کا عمق' اقبالؔ کی دسعتوں سے ہوتا ہوا فیضؔ کے کاروبارِ گلشن میں داخل ہوا تو تخلیقی جدتوں سے ہم کنار ہو کر تازہ بستیاں آباد کرنے لگا۔ فیضؔ کے ہر مصرعے اور ہر لفظ کے پیچھے ایک شیریں چھپی بیٹھی ہے جو نطق و کلام میں شیرینیاں بانٹتی، پھول برساتی فکر کے افق پر نمودار ہوتی ہے تو سخن کی بدلیوں سے لالہ فام رم جھم برسات برسنا شروع ہوتی ہے۔ فیضؔ اپنے فلسفہ وفکر پر مدام قائم و دائم رہے۔ کوئی قہر، کوئی مہران کو اس راہ سے ہٹا نہ سکا۔ مختصر بات کام کی بات، ایک ہی بات۔ وہ سنار تھے، مگر لوہار کا ہتھوڑا بھی پاس رکھتے تھے۔ لگی لپٹی، ہیر پھیر، منافقت و ریا سے کبھی کسی طرح کا تعلق و واسطہ نہ رکھا۔ جو کہا ڈنکے کی چوٹ پہ کہا۔ مگر خوشبوؤں، رنگوں، نغموں کے لپکوں میں لپیٹ کر کہا۔ فلسفے کو شعر اور شعر کو فلسفہ بنا دیا۔ وہ رکے تو کوہِ گراں تھے۔ چلے تو جاں سے گزر گئے۔

یہ جون ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ فیضؔ صاحب نے سمرقند سے واپسی پر اپنی ایک تازہ نظم ”تین آوازیں“ سنائی جس کے تین حصے تھے: ظالم۔ مظلوم۔ ندائے غیب:

## ظالم:

جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو

عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گُل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گُہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا، راہِ طریقت بھی نئی
میرے قانوں بھی نئے، میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے
فرش پر آج درِ صدق و صفاء بند ہُوا
عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہُوا

## مظلوم:

رات چھائی تو ہراک درد کے دھارے چھوٹے
صبح پھوٹی تو ہراک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رَگ نے لہو برسایا
دن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا
یا خدا یہ مری ردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تُو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تُو نے
وہ یہ کہتے ہیں، تُو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں، ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

## ندائے غیب:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے

کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب وثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

لبنان کا دارالحکومت 'بیروت' یکے از قدیم ترین انسانی آبادی کا شہر ہے۔ تقریباً پانچ ہزار سال قبل بھی بیروت' کنعان (فونیشیائی تہذیب) ساحل کا ایک بامراد شہر کہلاتا تھا۔ اُس زمانے میں اسے 'بیروتھ' (چشموں کا شہر) کہا جاتا تھا۔ بیروت بحرۂ روم کے ساحل کی ایک ایسی ممتاز جگہ پر آباد ہے جس کی پشت پر عجوبۂ روزگار پہاڑی سلسلہ ہے۔ بیروت رومن امپائر کے زمانے میں بھی بیحد جلیل القدر شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اُس دوران اسے 'کولونیا'، 'جولیا'، 'اوگستا'، 'فیلکس' اور 'بیروتھ' پکارا جاتا تھا۔ یہ بیروت ہی ہے جسے انسانی تاریخ کا پہلا ''اسکول آف لاء'' قائم کرنے کا فخر حاصل ہے۔ 'اسکول آف لاء' کا سنہری دور، رومن امپائر لوئیس ہفتم سنہ (۱۹۳۔۲۱۱ء) کا زمانہ ہے جب بیروت، ایتھنز اور روم کے لاء اسکولوں پر سبقت لے گیا تھا۔ ان ہی دنوں بیروت اسکول آف لاء کے پروفیسروں نے مشہورِ زمانہ ''مجموعۂ قوانین'' مرتب کیا تھا۔ جس کے سبب بیروت کو ''مادرِ قانون سازی'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۵۵۱ء میں آنے والے ایک بھیانک زلزلہ نے بیروت کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ جس کے سو سال بعد عرب مسلمانوں نے اسے فتح کیا جس کے بعد یہاں ۱۱۰۹ء میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عثمانیوں نے یہاں ۱۹۱۶ء تک چار سو سال

حکومت کی ۔۱۹۴۳ء تک فرنچ کے زیرِ انتظام رہا۔ ۱۹۸۱ء۔ ۱۹۸۲ء کے دوران فلسطینی مجاہدین کے زیرِ انتظام رہااور ۱۹۸۲ء۔۱۹۸۳ء میں اسرائیلیوں کا تسلط قائم رہا۔ ۱۹۹۰ء میں سیرین فوجیوں کے زیرِ انتظام آ گیا۔ بیروت کی سیاسی تاریخ بیحد متنازعہ رہی ہے اور اس دوران بیروت سات مرتبہ مکمل طور پر پائمال کیا جاچکا ہے۔ اس کے باوجود بیروت ہمیشہ سے ایک انفرادی تہذیبی اور تجارتی مرکز رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ساٹھ کی دھائی میں بیروت شرقِ اوسط کا پیرس کہلاتا تھااور عرب ممالک کے شیوخ کا گھر آنگن ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ جب فیض صاحب الجزائر کے مختصر دورے کے بعد بیروت واپس آئے تو کہنے لگے بھئی آپ نے کہا تھا کہ ہمیں یہاں کے تاریخی آثار دکھائیں گے۔ہم نے کہا ٹھیک ہے اگلے اتوار ہم آپ کو بعلبک کے کھنڈرات دکھانے لے چلتے ہیں۔

بعلبک کو ''سورج کا شہر'' بھی کہا جاتا ہے۔یہ سطح سمندر سے ۳۰۰۰ فیٹ کی بلندی پر وادیٔ بقاء میں واقع ہے۔بعلبک کے کھنڈرات اپنے دامن میں عہدِ روما کی تعمیرات سے دنیا کی عظیم ترین اور نہایت بہتر حالت میں محفوظ قوی ہیکل تعمیری ڈھانچہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ جو رومن کے بلند ترین ستونوں والے معبدوں کا کمپلیکس ہے۔ جہاں رومن دیوتاؤں کی عبادت کی جاتی تھی۔ان جگہوں کو دیکھنے کے دوران جب ہم لوگ ''معبد عطارد'' کے گھنڈرات میں داخل ہوئے تو اس وقت تک فیض صاحب بیحد تھک چکے تھے۔لہٰذا ہم نے اپنے کاندھے پر لٹکے سفری بیگ سے مشروب کی بوتل نکال کر انہیں پیش کی اور فیض صاحب وہیں ایک چبوترے پر بیٹھ

گئے۔ جب ذرا سانس بحال ہوئی تو وہ کسی مشاق گائیڈ کی طرح Jupiter Temple کی تاریخ بیان کرنے لگے اور بتایا کہ یہ جو آپ اس معبد کے صرف چھ سالم ستون دیکھ رہے ہیں۔ اصل میں اس معبد کے ۵۴ ستون تھے اور یہ معبد ۳۰۰۰ قبلِ مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ فیض صاحب کے منہ سے بعلبک کے کھنڈارت کی تفصیلات سن سن کر ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑے صاحب اپنا ''ہوم ورک'' کر کے آئے ہیں۔ بہرحال اب چونکہ دن بھی ڈھل چلا تھا اور فیض صاحب بھی کافی تھک چکے تھے۔ لہٰذا اگلی بار عہدِ خلافتِ امیہ میں تعمیر کی جانے والی عظیم مملوک مساجد جو اطراف میں پھیلے قدیم سفید اور سلیٹی پہاڑوں سے سلیں تراش کر تعمیر کی گئیں تھیں۔ دیکھنے کا پروگرام طے کرنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپسی ہوئی۔

ہم نے کیا یہ تھا کہ حصولِ تعلیم کے لیے بیروت منتقلی کے دن جدّہ سے اپنے ذاتی استعمال کی نئی کار، بحری جہاز سے بیروت روانہ کردی تھی۔ تاکہ وہاں گھومنے پھرنے میں سہولت رہے اور اب جب ہماری کار جدّہ سے بیروت پورٹ پر پہنچ گئی تو ''جمارک البنانیہ بیروت'' کی جانب سے اطلاع آ گئی کہ آ کر اپنی گاڑی لے جائیں۔ لہٰذا یہ خوش خبری ہم نے فیض صاحب کو دی اور کہا کہ اب ہماری گاڑی آ گئی ہے لہٰذا اگلے اتوار کو ہم آپ کو عہدِ خلافت اُمیّہ میں تعمیر کی جانے والی عظیم مملوک مسجد ''مسجد العُمیری'' دکھانے لے چلیں گے۔

مملوک مسلم بادشاہوں نے مصر، شام اور لبنان کے کچھ حصّوں پر گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک حکمرانی کی۔ اس دوران بیروت کو شرقِ اوسط اور یورپ کے درمیان تجارتی سطح پر مرکزی حیثیت حاصل ہوئی جس کے سبب

لبنان کومعاشی، تجارتی، علمی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی عروج حاصل ہوا جو مملوک دورِ حکومت کے اختتام تک قائم رہا۔ اُسی دور میں اسلامی طرزِ تعمیر کی عکاس لاتعداد عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں مملوک مساجد نمایاں اور قابلِ دید ہیں۔ اسی سلسلۂ تعمیر کی ایک عظیم مسجد "مسجد العُمیر" ہے۔ جو الحمراء میں شارع جلو اور شارع پیرس کے سنگم پر واقع ہے اور ہم اسی عظیم الشان مسجد کی زیارت کے لیے فیضؔ صاحب کو لے کر گئے۔ اس مسجد کی تعمیر بیروت شہر کے اطراف میں پھیلے ہوئے سفید اور سلیٹی پہاڑوں سے سلیں تراش کر، کی گئی ہے۔ جس آرکیٹیکٹ نے اسے ڈیزائن کیا ہے، اُس نے اس کی ڈیزائننگ اور ڈیکوریشن میں اپنی اعلیٰ فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسجد کا بہت بڑا گنبد، خوبصورت بلند محرابیں، چوڑے اور پھول پتّوں سے تراشیدہ درجنوں ستون، وسیع اور عریض صحن۔ مختصر یہ کہ "مسجد العُمیری" کا شمار دنیا کی عالیشان مساجد میں ہوتا ہے۔ فیضؔ صاحب تو اس مسجد میں داخل ہوکر مبہوت سے ہوگئے تھے۔ انہوں نے اس کے ایک ایک ستون، دیوار اور تراش خراش کو بغور جائزہ لیا اور اس کے تعمیری حسن سے بیحد متاثر ہوئے۔

فیض احمد فیضؔ کے مذہب کے حوالے سے ہم نے کہیں پڑھا ہوا تھا کہ کسی مذہبی انتہاپسند نے فیضؔ صاحب سے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا۔

ان کا جواب تھا "میرا مذہب وہی ہے، جو مولانا رومی کا تھا۔"

پوچھا گیا "مولانا رومی کا کیا مذہب تھا"

فیضؔ نے کہا "اُن کا مذہب وہی تھا، جو میرا ہے۔"

فیضؔ کے اس جواب پر، اُن صاحب نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے۔ خاں

سے فیضؔ صاحب کی جانب دیکھا۔

فیضؔ صاحب نے وضاحت کی۔ ''ایک بار واعظان کرام مولانا رومی کے پاس پہنچے اور ان سے، ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا، کہ آپ کا تعلق کس فِرقے سے ہے؟ رومؔی نے جواب دیا کہ تمام ۷۲ فرقوں سے۔ واعظان کرام کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ لہٰذا ان میں سے ایک نے فتویٰ صادر کیا کہ'' پھر تو آپ مُرتد اور کافر ٹھہرے'' مولانا رومی نے برجستہ جواب دیا۔ ''اگر آپ اِس پر خوش ہیں، تو مان لیتا ہوں۔''

فیضؔ صاحب کے حوالے سے اس واقعے کی بنیاد پر، بیروت کی ایک ملاقات میں ایک روز فیضؔ صاحب سے پوچھا: فیضؔ صاحب! کیا فرماتے ہیں آپ بیچ اِس مسئلے کے؟

فیضؔ صاحب نے فرمایا: آپ کے لیے بھی میرا وہی جواب ہے لیکن یہاں میں مذہب اور دین کے حوالے سے ایک تقابلی جائزہ پیش کرنا چاہوں گا:

☆ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق اور داخلی تجربے کا نام ہے۔
☆ دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
☆ مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔
☆ دین میں معاشرے کا انداز اور آئین بناسکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے یا نہیں۔
☆ مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔

☆ دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

☆ مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے انسانی اعمال کے صحیح نتائج کو پرکھا جا سکے۔

☆ دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج بتاتے ہیں کہ ملّت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔

☆ مذہب انسان کو فرقوں میں بانٹتا ہے اور ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔

☆ دین میں تفرقہ شرک ہے۔ دینِ اسلام، بنی نوعِ انسانی کیلیے ہے۔ رب، رب العالمین ہے۔

☆ مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کیے چلا جاتا ہے۔

☆ دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات پر قابو پانے کی تعلیم دیتا ہے۔

☆ مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

☆ دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

☆ مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

☆ دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

☆ مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بناتا ہے۔

☆ دین، اسے تقدیر شکن قوّت عطاء کر کے، حرکت وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

☆ مذہب آغوشِ خاک میں تسبیح ومناجات کا نام عبادت رکھ کر انسان کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

☆ دین، وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام اور نظامِ خداوندی کو باطل پر غالب کرنا عبادت۔

☆ مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور اللہ کی نعمتوں سے اجتناب سکھاتا ہے۔

☆ دین، اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو اللہ کی پیدا کی، زیب وزینت کی اشیاء کو تم پر حرام کہتا ہے۔

☆ مذہب ہر جدّت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

☆ دین کہتا ہے کُل یوم ھو فی شان. ہر نئے دور میں جدّت طرازی تقاضائے حیات ہے۔

☆ مذہب، اسلاف کے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم ودلیل لانے پر زور دیتا ہے۔

☆ دین، مسالکِ اسلاف کی بلا دلیل پیروی سے منع اور عقل وتدبّر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔

☆ مذہب کا تصوّر مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون) سرمایہ دارانہ (قارون) اور مذہبی پیشوایت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ اور خود،

مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

☆ دین، مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی۔ کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لیے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لیے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

اس لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے، دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں، دین کی اطاعت کرتا ہے۔ فیضؔ صاحب کی اس عالمانہ گفتگو نے دین، مذہب اور ان کے عقیدے کے حوالے سے ان کی پوزیشن کلیئر کر دی۔

یہ ۱۹۸۰ء کا وسطی زمانہ تھا۔ اُن دنوں بیروت کی فضاء انتہائی شکست خوردگی اور ناکسی کے لمحے کی مظہر تھی۔ ساری دنیا اس بات کی تماشائی۔ ایک ذرا سی امید پیدا ہوتی کہ مایوسی چھا جاتی۔ اُن ہی دنوں ایک مرتبہ کی ملاقات میں فیضؔ صاحب نے اپنی تازہ نظم ''کیا کریں'' سنائی۔ جو غیر یقینی۔ گھبراہٹ ... اور ... بد دلی .... کی منہ بولتی تصویر ہے:

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں

جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے

سب قلم نزار ہیں

جو میرے تیرے شہر کی

ہر اک گلی میں

میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں

جو میری تیری رات کے

ستارے زخم زخم ہیں

جو میری تیری صبح کے

گلاب چاک چاک ہیں

یہ زخم سارے بے دوا

یہ چاک سارے بے رفو

کسی پہ راکھ چاند کی

کسی پہ اوس کا لہو

یہ ہے بھی یا نہیں، بتا

یہ ہے کہ محض جال ہے

مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا، بُنا ہوا

جو ہے تو اِس کا کیا کریں

نہیں ہے تو بھی کیا کریں

بتا، بتا

نظم کی اختتامی سطور میں ''بتا، بتا'' کی تکرار میں کتنا تذبذب اور عدم اعتماد ہے۔ شاعر کو کتنے سوالوں کے جواب کا انتظار ہے۔ ہر مصرع ایک استعارہ ایک دبی ہوئی چیخ اور درد کی کراہ معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے عہد کے عظیم شاعر اور بیحد پیارے انسان فیض احمد فیضؔ نے جو ورثہ چھوڑا ہے، ہم اس ورثے سے جتنا بھی استفادہ کریں کم ہے۔ یہ ورثہ زندگی کے کئی شعبوں پر محیط ہے کیونکہ فیضؔ نہ صرف شاعر بلکہ مفکر، نقاد، صحافی، ٹریڈ یونیسٹ اور انسان دوست سیاست داں بھی تھے۔ وہ ایک نظریۂ حیات کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری اور زندگی اس نظریے کی عکاس ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب فیضؔ نے ترقی پسندی کے دبستان میں قدم رکھا تو یہ سیکھا کہ فرد کی ذات انسانی معاشرے سے منسلک ہے۔ وہ بجائے خود، بہت ہی محدود اور حقیر ہے لیکن عالمِ موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے اسے پہنائی اور وسعت بخشتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک ہی تجربے کے دو پہلو بن جاتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ اردو دنیا میں اپنے اشتراکی نظریات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ وہ مذہب پرست، جو شاعری کو مذہب یا تصوف کے کسی پہلو کی تبلیغ کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ وہ فیضؔ کے اُن اشعار کو پیش کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوجائے کہ فیضؔ کے دل کے کسی گوشے سے مذہب یا تصوف جھانکتا رہتا تھا۔ ان کا یہ کہنا کسی حد تک درست ہے۔ معجزے کے انتظار کے علاوہ فیضؔ کی بیشتر نظمیں مذ
مفہوم میں ''قیامت'' اور اشتراکی مفہوم میں ''انقلاب'' جیسے اہم فلسفوں کو کچھ
طرح سے پیش کرتی ہیں کہ دونوں فلسفوں میں امتیاز قائم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

کے اعتبار سے دونوں فلسفوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں فلسفے استحصال سے پاک نئی زندگی کے ظہور کو یقینی سمجھتے ہیں۔ دونوں فلسفوں میں معیاری جست لگتی ہے۔ صور کا پھونکا جانا اور انقلاب کا برپا ہونا۔ ایک نظام کا خاتمہ، کسی دوسرے نظام کی زندگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ جس کی مثال بیروت میں جلا وطنی کے دوسرے پڑاؤ کے عرصے میں کہی ہوئی فیض صاحب کی مشہور نظم "ویبقیٰ وجہ ربک" ہے۔ بیروت ۱۹۷۹ء میں پہلی بار جب یہ نظم میں نے ان کی زبانی سنی تو مجھ پر ایک وجدانی کیفیت سی طاری ہوگئی تھی:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے

ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اُردو کی عشقیہ شاعری کے صدیوں پرانے الفاظ کو فیضؔ نے برتتے ہوئے ان میں انفرادی شان کس طرح پیدا کی، معنی آفرینی اور حُسن کاری کا حق کس طرح ادا کیا، ان میں جو نئے نئے معنوی امکانات پیدا کئے وہ ان کے ذہن کی خلاّقی کا کارنامہ ہیں۔ مثلاً انہوں نے کہا:

گلچیں: (سیاسی نصب العین کے حصول میں رکاوٹ ڈالنے والے عوامل)

حاکم: (سامراج رسرمایہ داری رتاناشاہی رعسکری نظام)

عقل: (مصلحت کوشی، منفعت اندیشی، جابر نظام، دفتر شاہی یا عسکری نظام سے سمجھوتہ بازی)

محتسب، شیخ: (سامراجی نظام/سرمایہ دارانہ ریاست/عوام دشمن حکومت/رجعت پسندانہ نظام/ظلمت پسند یا زوال آمادہ ذہنیت)

ہجر، فراق: (جبر/ظلم/استحصال کی حالت/یا انقلاب سے دوری)

رقیب: (سامراج/سرمایہ داری)

گُل: (سیاسی آدرش/نصب العین)

زنداں، دارورسن: (سیاسی قید/پھانسی/جان کی قربانی)

حُسن، حق: (سماجی انصاف/انقلاب/سماجی سچائی)

شراب، میخانہ، پیالہ، ساقی: (سماجی اور سیاسی بیداری کے ذرائع)

وصل: (انقلاب/آزادی/حریت/سماجی تبدیلی)

معشوق: (وطن/عوام)

بلبل، عندلیب: (جذبۂ قومیت، حریت سے سرشار شاعر/انقلابی)

مجاہد: (مجاہدِ آزادی/انقلابی)

جنون: (سماجی انصاف/انقلاب/انقلاب کی خواہش/تڑپ)

رند: (مجاہد/انقلابی/باغی)

عشق: (انقلابی ولولہ/جذبۂ حریت)

عاشق: (مجاہد/انقلابی)

اسی تناظر میں فیضؔ کی ایک اور نظم دیکھتے ہیں، اپنی یہ تازہ نظم بھی انہوں نے ۱۹۷۹ء ہی میں تاشقند سے واپسی پر سنائی تھی:

## لاؤ تو قتل نامہ مرا

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

قیامِ بیروت کے دوران ''تخلیقِ ادب'' کے حوالے سے بارہا فیضؔ صاحب سے گفتگو رہی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے تھے کہ ادب کی تخلیق ایک سماجی فعل ہے۔ اُن کے نزدیک ادب الفاظ کے وسیلے سے انسانی تجزیے کے مؤثر اور باسلیقہ اظہار کا نام ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے:

دیکھیں زلفی! ادیب سماج کا ایک باشعور رکن ہوتا ہے۔ اپنے سماج یا معاشرے سے ادیب کے دو رشتے ہیں۔ ایک سماج کے عام رکن کی حیثیت سے اور

دوسرا ادیب کی حیثیت سے۔ اس طرح ادیب پر دہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ عام رکن کی حیثیت سے اس پر وہ تمام ذمے داریاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں جو دیگر تمام اراکین پر عائد ہیں۔ ادیب کی حیثیت سے اس پر یہ خصوصی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی تخلیقات اور تحریریں باطل کے خلاف حق کا ساتھ دیں، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں، حُسن کو فروغ دیں اور بدصورتی کو رد کریں۔ علم کی روشنی کو پھیلائیں اور جہالت کی تاریکیاں دُور کریں، انسانیت سے محبت پیدا کریں، بربریت اور نفرت کا خاتمہ کریں، نیکی اور پاکیزگی کی طرف مائل کریں اور انسان دشمنی اور خودغرضی کا درس نہ دیں۔

فیضؔ نے امن کا لینن انعام قبول کرنے کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا:

''امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں، اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست و دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں، جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور استحصال کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں، جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔''

فیضؔ نے اپنے وطن اور تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں میں آزادی کی قوت، یعنی غریب، محنت کش اور مظلوم عوام کا ساتھ دیا۔ انھوں نے اپنے وطن کے عوام کے حقوق کے لیے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔

تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں کی آزادی کی جدوجہد کرنے والے عوام کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور افریقی لوگوں، ایرانی جوانوں اور فلسطینی مجاہدوں کے لیے نغمے لکھے۔ اُس وقت جب لبنان میں خانہ جنگی ہورہی تھی اور اسرائیل نے حملہ کردیا تھا اور صہیونی فوجوں کے ٹینک، توپیں اور طیارے بیروت پر آگ برسا رہے تھے۔

میں تو اپنی تعلیم مکمل کر کے جدّہ واپس جاچکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ فیضؔ صاحب تب بھی پوری استقامت کے ساتھ بیروتؔ کے ایک فلیٹ میں بیٹھے تیسری دنیا کے ترجمان میگزین ''لوٹس'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس دوران کچھ عرصے کے لیے جب اسرائیل کی بمباری میں وقفہ آیا اور یو این او کی امن فوج بیروت پہنچی تو بیرونی ممالک کی فضائی پروازیں بحال ہوئیں، تو میں بھی اپنی ائرلائنز کی منصبی ذمے داریوں کی ادائیگی کے لیے بیروتؔ گیا اور موقع ملتے ہی فیضؔ صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ان کے فلیٹ پر حاضری دی۔ اُس بلڈنگ کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اطراف کی دیگر عمارتوں کے ساتھ اُن کے فلیٹ والی بلڈنگ پر بھی جا بجا بمباری کی ٹوٹ پھوٹ نظر آرہی تھی۔ بیشتر کھڑکیوں بشمول ان کے فلیٹ کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ جب میں لرزیدہ قدموں اور دھڑکتے دل کے ساتھ فیضؔ صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوا تو انہیں نہایت صبر وسکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا پایا۔

میں نے پوچھا فیضؔ صاحب آپ لوگ خیریت سے تو ہیں نا۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟ آپ لوگ کسی اور محفوظ جگہ منتقل کیوں نہیں ہوجاتے۔

میری اس تمام فکر و تشویش کے جواب میں فیضؔ صاحب نے صرف اتنا

کہا: بھئی اب کہاں جائیں گے۔ پورا بیروت ہی زد میں ہے اور اب تو UNO کی امن فوج بھی آ گئی ہے۔ کچھ دن سے سکون بھی ہے۔ اب آپ واپس جا کر ہر پرسانِ حال کو بتا دیں کہ میں خیریت سے ہوں۔

ہم نے عرض کیا: فیضؔ صاحب اِس کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے تو بدلوالیں۔ آج کل سردی بھی کافی ہے اور پھر ساحلِ سمندر کی ٹھنڈی ہوائیں۔ آپ کے جوڑوں کا درد نہ شروع ہو جائے۔

کہنے لگے: بھئی بلڈنگ کا مالک آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ابھی بلڈنگ کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کروانا بیکار ہے۔ ہوسکتا ہے کل پھر کوئی اسرائیلی جہاز بمب ٹپکا جائے۔

فیضؔ صاحب سے ملاقات کے دوران ہمیشہ ہمیں اس بات کا احساس رہتا تھا کہ بیروتؔ ایک ایسا شہر ہے جہاں ان کا کوئی ہم زبان، سننے سنانے والا نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے اپنی ہر ملاقات کے موقع پر ہم ان کا تازہ کلام ضرور سنتے۔ اسی طرح وہ بھی اکثر یہ کہہ کر کہ: ’’بھئی ہم نے تو کچھ کہا نہیں ہے۔ آپ ہی کچھ سنائیں‘‘ ہماری ہمت افزائی فرماتے رہتے۔

اس مرتبہ بھی جب ہم نے پوچھا: فیضؔ صاحب! بیروت میں توپوں کی اِس گھن گرج کے دوران کچھ لکھا۔

کہنے لگے: ہاں بھئی کچھ شعر کہے تو ہیں۔

ہم نے مودبانہ درخواست کی۔ عطاء ہوں حضور۔

انہوں نے اپنے فلیٹ کی شیشہ ٹوٹی کھڑکی سے باہر سمندر کے ساکت پانی

پر نظریں ٹھہرا کر اپنی نامکمل غزل سنائی:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شامِ ہجر کی مدتیں
جو تمہاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں
چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم، جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں
مری جان، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

عوام دوستی اور وطن پرستی ہی نے فیض کی رہنمائی انسان دوستی اور انسانیت پرستی کی طرف کی تھی۔ حبِ وطن اور حبِ انسانیت کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ دونوں کی بنیاد محبت ہے۔ محبت کا جذبہ جب وسعت اختیار کرتا ہے تو قوم کی محبت اور پھر انسانیت کی محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ بنیادی جذبہ ہے جس کے شجر سے انسانی زندگی کو حُسن اور دوام بخشنے والی خصوصیات اور اقدار مثلاً اخلاص، مروت، رواداری وغیرہ کے اکھوے پھوٹتے ہیں۔ فیض کے دل میں جب محبت کا شجر پروان چڑھا اور اس کے سائے دور دور تک پھیلنے لگے تو وطن دشمن اور انسانیت دشمن استحصالی طبقے فیض کے دشمن بن گئے۔ فیض کی ذات ان کے ظلم وستم کا نشانہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ فیض کے دل میں جو شجر تھا وہ درد کا شجر بن گیا۔ محبت نے انہیں درویشانہ بلکہ میں تو کہوں گا کہ پیغمبرانہ صفات بھی بخشی تھیں۔ وہ قلب ونظر کی وسعت، ہمدردی، مروّت، نرمی، رواداری، غرضیکہ حُسنِ اخلاق کی تمام صفات کا پیکر تھے۔ دوست تو دوست، دشمن بھی ان کی صفات کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ فیضؔ کے دشمن بہتان تراشی کرتے اور خوامخواہ کیچڑ اچھالتے رہتے تھے لیکن وہ کبھی کسی کو جواب نہیں دیتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جھوٹ کی دھول کتنی ہی اُڑائی جائے، سچ آخرعیاں ہو کر رہتا ہے۔

شعر وادب کا موجودہ دور فیضؔ کا دور ہے۔ جن معروضی حالات نے فیضؔ اوران کی شاعری کو جنم دیا تھا وہ ابھی نہیں بدلے ہیں اور شاید ایک عرصے تک نہیں بدلیں گے۔ انہوں نے اپنے مخصوص غنائی انداز اور روایتی پیرائے میں جدید دور کی حسیّت کی ترجمانی کا فرض انجام دیا۔ پاکستان بننے کے بعد جب فوجی سازش کرنے والوں کے ساتھ بے گناہ ترقی پسندوں کو بھی ملوث کیا گیا، فیضؔ صاحب کو جیل بھیج دیا گیا اور ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم پر بھرپور حملہ کیا گیا، تو متوسط طبقے کے بڑے بڑے معتبر ترقی پسند ادیب وشاعر اصولوں پر سمجھوتہ کر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے لیکن فیضؔ نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور تنظیمی انتشار کے باوجود ترقی پسند تحریک کو زندہ رکھا۔ فیضؔ نے نئے ادیبوں اور نئی نسل کو یہ پیغام دیا کہ "آدمی کی اپنی ذات اتنی اہم نہیں، جتنے کہ انسانیت کے تقاضے ہیں۔ انسانیت کے جو مسائل درپیش ہیں انہیں حل کرنے کی کوشش کریں۔"

گو فیضؔ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ تنقید ان کا میدان نہیں تھا لیکن فیضؔ نرے شاعر بھی نہیں تھے۔ ادبی مسائل اور رجحانات پر ان کی نگاہ تھی۔ معاشرہ،

سیاست، سائنس، نفسیات ہر ایک ان کے مطالعے کا محور تھے۔ برِ صغیر اور دنیا کے حالات و کوائف سے وہ باخبر تھے۔ شاعر کے لیے عالم فاضل ہونا شاید ضروری نہ ہو لیکن علم اور شعور کے بغیر اچھی اور بڑی شاعری کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔

فیضؔ کو شاید دن رات یک گونہ بے خودی محبوب ہو لیکن وہ دن رات محض فکرِ سخن میں محو نہیں رہتے تھے۔ وہ کل وقتی شاعر ہرگز نہیں تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ادبی اور غیر ادبی مسائل اور مطالبات سے واقف رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ فیضؔ مزاجاً کم گو تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ انہیں غور و فکر کے لیے زیادہ وقت میسر تھا۔

یہ بات ہم اس لیے اور بھی کہہ رہے ہیں کہ اپنے قیامِ بیروت کے دو سال اور پھر اس کے بعد کے دو برس جب ہم ہر ماہ بیروت کا پھیرا لگاتے تھے، ہم نے تو یہ دیکھا کہ فیضؔ صاحب نے شاعری کے مقابلے میں نثر نگاری زیادہ کی جس کا ثبوت ان کے قیامِ بیروت کے دوران کی جانے والی شاعری پر مشتمل مجموعہ "مرے دل مرے مسافر" ہے جس میں محض اکتیس (۳۱) نظمیں اور غزلیں درج ہیں۔ فیضؔ ابتدا ہی سے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر رہے۔ ۱۹۳۶ء۔۱۹۳۵ء میں جب وہ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرار تھے تو محمود الظفر وہاں پرنسپل تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ بنے بھائی (سجاد ظہیر) سے بھی ان ہی دنوں روابط قائم ہوئے۔ اس طرح فیض احمد فیضؔ بھی ترقی پسند ادبی تحریک کے ابتدائی مبلغوں میں ہیں۔ یہاں بات چونکہ فیضؔ صاحب کی نثر نگاری کے حوالے سے ہو رہی ہے لہٰذا ہم ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے ان کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرنا چاہیں گے جو ان کے مخصوص، نرم رو، ترغیبی لہجے میں ہے:

''ترقی پسند ادیب ان اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے جن کے بیان اور تجزیے سے ترقی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی ہے۔ وہ ذاتی اور اجتماعی، بنیادی اور فروعی، اہم اور غیر اہم سبھی قسم کے تجربات کر سکتا ہے بہ شرطیکہ وہ ان میں کوئی نہ کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے ان کی اہمیت اور غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ تجربات تخلیق نہیں کیے جا سکتے، لیکن ان میں انتخاب تو کیا جا سکتا ہے اور ہم ترقی پسند ادیب سے صرف اتنا ہی تقاضہ کرتے ہیں کہ ان کا انتخاب گمراہ کن نہ ہو تاکہ اس کے پڑھنے والے زندگی کے اہم مسائل کو بھلا کر غیر ضروری تفصیلات میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے موضوعات ہیں جو ''گمراہ کن'' ہیں اور جن کا تعلق ''زندگی کے اہم مسائل'' سے نہیں ہے۔ اس ضمن میں جب ہم نے فیضؔ صاحب سے نشان دہی چاہی تو انہوں نے فرمایا:

''یہ ایک ہی تجربہ کئی طرح سے بیان ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ٹی پارٹی میں محض رومانی چھیڑ چھاڑ بھی دکھائی جا سکتی ہے۔ کندۂ ناتراش امراء کی ذہنیت کا نقشہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے سماجی تعلقات کا کھوکھلا پن بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ماحول اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ آپ اسے قبول کر لیں اور اس طرح بھی کہ آپ اس کے خلاف بغاوت کریں۔ ترقی پسند ادیب اگر اپنے ماحول کو تسلی بخش سمجھتا ہے تو پہلا پیرایہ اختیار کرتا ہے، غیر تسلی بخش خیال کرتا ہے تو دوسرا۔''

ایک مرتبہ فیضؔ صاحب سے ادب میں جمالیات کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے ادب میں جمالیات اور افادیت کے باہمی رشتے پر بڑی

خوبصورت بات کہی۔ کہنے لگے:

''اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے تو آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی افزائش بجائے خود سماجی زندگی کی آسودگی اور بہتری میں اضافہ کرتی ہے یا دوسرے الفاظ میں حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں' افادی فعل بھی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو، جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، اس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے،، اس کی رو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو، صرف حسین ہی نہیں، مفید بھی ہے۔ اسی وجہ سے جملہ غنائیہ ادب، بلکہ تمام اچھا آرٹ ہمارے لیے قابلِ قدر ہے۔ یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دور کے خاص سیاسی یا اقتصادی مسائل کا براہِ راست تجزیہ کیا گیا ہو۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کسی شاعر کا کلام جمالیاتی تاثر کے اعتبار سے ناقص ہے تو یہ نقص اس کی افادیت پر بھی اثر انداز ہوگا۔ ایسا کلام نہ صرف فنی جمالیاتی اعتبار سے حقیر ہوگا بلکہ اس کی افادیت بھی مشکوک ہوگی اور اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا مضمون دوسری خوبیوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہوسکتا۔''

ہوسکتا ہے غیر ترقی پسندوں یا ادب برائے ادب پر اصرار کرنے والوں کو شاید فیضؔ صاحب کی اس گفتگو سے اختلاف ہو لیکن فیضؔ کو اپنے ترقی پسندانہ کردار کا پورا احساس ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا:

''اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے، اگر آپ جمالیاتی قدر کی ''سماجیت'' کو

تسلیم کرتے ہیں تو لامحالہ آپ کو یہ بھی ماننا ہوگا کہ نہ صرف اس قدر کے مقصود کو دوسرے اہم سماجی مقاصد سے الگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس قدر کے نقش ونگار سماجی حقیقتوں کے گوشت پوست ہی پر ابھرتے ہیں۔ شعر کی حقیقت سے بے تعلقی کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی حسین چہرہ اپنے جسم سے پیوست نہ ہوا۔ چنانچہ اپنے زمانے کی اہم سماجی حقیقتوں کا احساس اور ادراک اور ان کا موزوں اور مؤثر اظہار شعر کی افادیت ہی میں اضافہ نہیں کرتا، اس کی جمالیاتی قیمت بھی بڑھاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے موزوں اور صحت مند جسم کسی حسین چہرے کو سہارا ہی نہیں دیتا، اس کے حسن کا ایک لازمی جزو بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہم ایک حساس اور ذکی شاعر سے نہ صرف سماج اور انسانیت کی بہتری کے لیے ہی نہیں بلکہ فن ور جمالیات کے فروغ کی خاطر بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم عصر زندگی کی صحیح قدریں پہچانے اور انہیں پہچاننے میں دوسروں کی رہنمائی کرے۔ اسی وجہ سے امن، آزادی، حب الوطنی، سلطانی جمہور، موجودہ زمانے میں ہماری شاعری کے اہم موضوع ہونا چاہئیں اور ہیں۔ اسی وجہ سے شعر و ادب کو آزادی، راحت اور آسودگی کے لیے نوعِ انسانی کی عالمگیر جدوجہد سے صرف علیحدہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ شعر وادب کی نمو اسی میں ہے کہ اس کارزار میں شاعر اور ادیب صحیح طرف ہوں۔"

فیضؔ صاحب کی اس گفتگو کا اگر ہم خلاصہ کریں تو:

(۱) شعر کی جمالیاتی قدر کافی حد تک شاعری کی دوسری قدروں پر منحصر ہے۔

(۲) ان قدروں کی ترتیب ان کی سماجی اہمیت کے مطابق ہونا چاہیے۔

(۳) جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے، جو اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتی ہے، اس

لیے اسے دوسری افادی قدروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔ اس لیے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر ہی نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اترے۔ یعنی خود فیض کی اپنی شاعری کے لیے وجہِ جواز:

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر، کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اصل میں ترقی پسندوں سے غلطی یہی ہوئی کہ انہوں نے اپنے ادب کو زندگی کے معیار پر پورا اتارنے کی کوشش تو کی لیکن اکثر وہ فن کے معیار پر پورے نہ اتر سکے۔ ادب کی جمالیاتی قدریں اس حد تک انہیں مرغوب نہیں رہیں۔ جتنی کہ اس کا افادی پہلو۔ کاش فیض ایک مخصوص دور کے شاعر کے منصب سے زیادہ دوامی اقدار کی حامل شاعری کے منصب کی باتیں کرتے۔ یہی بات جب ہم نے دورانِ گفتگو ان سے کہی تو وہ گویا ہوئے۔ ''ادب کی طرح تنقید بھی وقت اور ماحول کی پیروی کرتی ہے۔ ادبی کتابیں پہلے لکھی جاتی ہیں' تنقیدی قوانین بعد میں وضع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کے نقادوں کو اپنے ہم عصر ادباء میں جو خصوصیتیں نظر آتی ہیں، انہیں کو وہ محاسن قرار دے لیتے ہیں اور پھر انہیں کو سامنے رکھ کر تنقید کے قواعد و ضوابط بھی مرتب کر لیتے ہیں۔ جب معاشی ماحول بدلتا ہے تو لکھنے والے بھی بدل جاتے ہیں اور نقاد کی آراء بھی۔''

ہم نے عرض کیا فیض صاحب! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ادب کا کوئی مستقل پیمانۂ تنقید نہیں ہے، یعنی ایک ایسا پیمانۂ تنقید جس کا اطلاق بہ یک وقت۔ مثال

کے طور پر میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ پر ہو سکتا ہو اور ان کی شاعرانہ اہمیت اور عظمت کے اسباب و عوامل کا تجزیہ اور تعین کر سکتا ہو۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شاعری جو اپنے جذبے، فکری عوامل اور لفظیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہے، انہیں پرکھنے کے پیمانے کیا ہوں گے۔ کیا میرؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف پیمانۂ تنقید ہوگا اور غالبؔ کو پرکھنے کے لیے مختلف؟ کیا ہر دور کے تنقیدی اصول مختلف ہوتے ہیں اور اپنی دور کے مخصوص معاشی، سیاسی اور سماجی مزاج کو سامنے رکھ کر متعین کیے جاتے ہیں؟

فیضؔ صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے فرمایا:

''بھئی ترقی پسندوں کا زیادہ زور ترسیل اور ابلاغ پر رہا ہے۔ وہ عوامی ادب تخلیق کرنے کی سعی اور عوام تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اکثر مانوس پیرایۂ اظہار کو اپنایا۔ مروّجہ اور مانوس ادبی ہیتوں سے انحراف کرنے کی کم ہی کوشش کی۔ ۱۹۳۶ء میں سردار جعفری نظمِ معرا کے مخالف تھے۔ سجاد ظہیر نے تو اس کے کئی سال بعد ۱۹۴۴ء میں بھی آزاد اور معرا نظم کی مذمت کی اور انہیں ''شیر خوار تجربے'' سے تعبیر کیا۔ اِدھر میں بھی اس کے حق میں نہیں ہوں۔ اب دیکھیں نا کہ عبدالحلیم شرر، علی حیدر طباطبائی اور زمانۂ حال کے چند شعرا نے بلینک ورس یعنی بے قافیہ نظموں کو رواج دینا چاہا۔ پنجاب کے اختر شیرانی اور ن۔م۔ راشد نے چند ایک خوبصورت سانیٹ لکھے، جو اس سلسلے میں سب سے تازہ تجربہ تھا۔ یہ دونوں تجربے، انتہا پسندی پر مبنی تھے۔ اسی لیے کلّی طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔ غالباً ہماری زبان ابھی بلینک ورس کی آزادی اور سانیٹ کی بندشوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ایک درمیانی

راستے کی ضرورت ہے جو نہ زیادہ نامانوس ہو، نہ جذبات کے اظہار میں رکاوٹیں پیدا کرے۔ چنانچہ آج کل بہت سی نظموں میں پرانی روایات اور جدید اختراعوں کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

ہم نے عرض کیا:

"فیضؔ صاحب شاید یہی وجہ ہے کہ آپ نے بھی قافیوں کی ترتیب میں آزادی ضرور برتی ہے لیکن "بالکل بے قافیہ" اور "مکمل آزاد" نظمیں شاذ ہی لکھی ہیں۔ بلکہ بقول آپ ہی کے الفاظ میں "پرانی روایات اور جدید اختراعوں کے مابین ایک قسم کا سمجھوتہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی پچھلے ہفتہ ہی یہاں بیروت میں آپ نے مجھے اپنی جو تازہ نظم "یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے" سنائی تھی اس میں تو یہ "سمجھوتہ" دور دور تک نظر آتا!"

ہماری اس بات پر فیضؔ صاحب زیرِلب مسکرائے اور ہمارے ذہن میں ان کی نظم گونجنے لگی:

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے افق کنارے
اداس رنگوں کی چاندنیا
اتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویا
تمام تارے
اکھڑ گئی سانس پتیوں کی

چلی گئیں اونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکم خامشی کا
تو چپ میں گم ہو گئیں صدائیں
سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اِس بجائے
بکھر گئے اس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغِ سفر نہیں ہے
یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے
یہ وقت آئے تو بے ارادہ

کبھی کبھی میں بھی دیکھتا ہوں
اتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گل بوٹے الفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خونِ جگر کے دھبے
یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا
یہ مہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل لب ہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت شیخِ بدزباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوش و وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو

فیض نے اپنے تمام مضامین میں کئی مسائل و مباحث پر اظہارِ خیال کیا ہے، یعنی جو اُن دنوں زیرِ بحث تھے۔ عموماً انہوں نے ایک اعتدال پسندانہ رویہ اختیار

کیا ہے۔ جو فیضؔ کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اشاریت اور علامت کے تعلق سے وہ میراجیؔ اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کے روّیے سے متفق نہیں۔ انہیں درمیانی راستہ پسند ہے۔

ایک دن فرمانے لگے:

''شعرا کی نئی پود ان پیچ در پیچ الجھنوں کو شعر میں ڈھالنے کے لیے بالکل نئی علامات کی فکر میں ہے۔ ان میں سے بعض کی علامات اتنی داخلی ہوگئی ہیں کہ سوائے ان کے دوسروں کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے تجربات میں کوئی بات ضرور مشترک ہونی چاہیے ورنہ ظاہر ہے کہ شعر کا پہلا مقصد یعنی ترجمانی فوت ہوجائے گا۔ یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ شاعر کی علامات ایسی دورازکار نہ ہوں کہ پڑھنے والا انہیں کسی تجربے یا تصور سے متعلق ہی نہ کرسکے۔ چنانچہ بعض شعرا نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کی علامات داخلی اور تمثیلی ضرور ہیں لیکن بعید از قیاس بھی نہیں۔ ان میں راشدؔ غالباً سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ تیسرے گروہ میں وہ شعرا ہیں جو اپنے کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ ان میں مجازؔ، مخدومؔ، جعفریؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ شاعری کو عام فہم اور سلیس بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے اوّل تو ان کے ہاں علامات کی زیادہ بھرمار نہیں اور جو علامات ہیں، روزمرّہ کے قریب ہیں۔''

فیضؔ صاحب جب بھی اپنے ہم عصر شعرا کی بات کرتے، تو میں دیکھتا تھا کہ وہ ن۔م۔راشدؔ کی شاعری کے بہت قائل نظر آتے اور ان کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کرتے تھے لیکن مجھے تعجب تب ہوتا کہ وہ نظم طباطبائی وغیرہ کی بے قافیہ شاعری اور راشدؔ کی سانیٹ نگاری کو انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن راشدؔ کی آزاد نظموں کو بہ

نظرِ استحسان دیکھتے ہیں!

آخر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا:

فیضؔ صاحب ایسا کیوں ہے!؟

کہنے لگے:

''نوجوانوں پر راشدؔ کو فوقیت حاصل ہے۔ کچھ اس لیے کہ ان کی شاعری، اُس دور کے نوجوانوں کی ذہنی کاوشوں کا بہترین آئینہ ہے اور کچھ اس لیے کہ انہوں نے طرزِ بیان میں ایک نیا اور نہایت کامیاب تجربہ کیا۔ راشدؔ نے نئے اور پرانے اسالیب کو نہایت خوش اسلوبی سے یک جا کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے اشعار آزادی اور لچک کے باوجود ترنم یا ہم آہنگی نہیں کھونے پاتے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو راشدؔ کی ایک نظم کا بند سناتا ہوں:

تجھ سے اک شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی

مجھ سے جس روز ستارہ ترا وابستہ ہوا

تو سمجھتی تھی کہ اک روز مرا ذہنِ رسا

اور مرے علم و ہنر

تیری زینت کو گہر لائیں گے

میرے رستے میں جو حائل ہوں ترے تیرہ نصیب

کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں

جب فیضؔ صاحب راشدؔ کی نظم کا بند سنا چکے تو ہم نے پوچھا:

میراجی کی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ہمارے اس سوال کو سن کر وہ چند سیکنڈ کے لیے خاموش رہے پھر بولے:

''بھئی میں اُن کی حد سے بڑھی ہوئی داخلیت پسندی کو نامعقول سمجھتا ہوں۔ ان کی علامات دن بہ دن ذاتی اور داخلی ہوتی جارہی ہیں جس کی ایک مبالغہ آمیز مثال میرا جی کا ایک مصرعہ ہے، جو افسوس ہے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاید انہوں نے کچھ یوں کہا ہے:

چل پڑا آیا کہیں کا، کالا کلوٹا کوّا

یہاں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعری کی محبوبہ سو رہی ہے۔ سونے میں کاجل رخسار تک بہہ آیا ہے اور اس کے ڈھلکے ہوئے کاجل کی صورت کچھ کوّے کی سی ہوگئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کوّے سے یہ کاجل مراد لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی دور کی کوڑی لانا ہر پڑھنے والے کے بس کا روگ نہیں۔''

اِس مرتبہ ہم نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا:

فیضؔ صاحب! میرا جی کی نثر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کہنے لگے:

''ان کی نثر کی ماہیت اور فضاء ان کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میرا جی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے، بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی ہے۔ ان مضامین کی نکھری ہوئی شفاف سطح پر ان مبہم سایوں اور غیر مجسم پرچھائیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، جو ان کے شعر کی امتیازی کیفیات ہیں۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام تر اسی پاسبانِ عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے، جسے وہ محملِ شعر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ ایک حد تک تو خیر شعر اور دلیل میں یہ فرق ناگزیر بھی ہے لیکن

میراجی کی تحریروں سے یہ صاف عیاں ہے کہ انہوں نے تنقیدی جانچ پرکھ کے لیے جذب و وجدان کے بجائے عقل وشعور کا انتخاب مجبوری سے نہیں، پسند اور ارادے سے کیا ہے۔ مختلف ادوار، اقسام اور اطراف کے ادب کی تفسیر، تفہیم اور تنقید میں وہ خالص عقلی اور شعوری دلائل وشواہد سے کام لیتے ہیں۔ موہوم داخلی کشش واکراہ کا کہیں سہارا نہیں لیتے۔ مجھے گمان ہوتا ہے کہ اگر ان مضامین کے تنقیدی مسلک اور عقائد کی روشنی میں میراجی کی شاعری کا مکرّر مطالعہ کیا جائے تو شاید اس کے بعض پہلو رائج تصورات سے مختلف نظر آئیں۔"

فیضؔ صاحب کے تنقیدی شعور، کشادہ دلی اور گہری نظر کے ساتھ لکھے ہوئے مضامین کے حوالے سے بیروت میں قیام کے دوران اکثر ان سے گفتگو رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ہم نے ان سے پوچھا:

فیضؔ صاحب! تقسیمِ ہند سے چند سال پہلے جب جوشؔ صاحب ترقی پسندوں کے قبلہ وکعبہ تھے۔ ان کی شہرت اور عظمت نصف النہار پر پہنچی ہوئی تھی جبکہ آپ اُس وقت اپنی شہرت کے ابتدائی دور سے گذر رہے تھے۔ اس زمانے میں کلیم الدین احمد کے علاوہ کسی اور معتبر نقاد نے جوشؔ کی شعری کمزوریوں کی بابت دوٹوک انداز میں فیصلہ نہیں دیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُس زمانے میں آپ نے بھی جوشؔ کی انقلابی نظموں کی خامیوں اور کوتاہیوں کی جانب توجہ دلائی تھی! یہ فرمایئے کہ آیا آپ نے بھی جوشؔ کی انانیت پسندی اور انفرادیت کی مدح سرائی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا؟

فیضؔ صاحب کہنے لگے:

زلفی صاحب! بات اصل میں یہ ہے کہ اسے جوشؔ صاحب کا کمال کہہ

لیجئے، یا کمزوری سمجھ لیجئے کہ انقلابی اور رندانہ شخصیتوں میں کوئی ربط یا علاقہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو اتنا نامحسوس کہ اگر ان کا کلام دو حصوں میں بانٹ دیا جائے تو سوائے اسلوبِ بیان کے، دونوں حصوں میں کوئی ذہنی یا جذباتی کیفیت مشترک نہیں، جبکہ اشتراکیت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ انقلاب کسی فرد یا کسی ایک شخص کی ذاتی کوششوں اور تدبر کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کی باہمی پیکار اور کش مکش سے نمودار ہوتا ہے۔ اس انقلاب میں فرد کی اہمیت طبقوں یا جماعتوں کی اہمیت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جوشؔ کی شاعرانہ طبیعت اور مزاج اس نظریے کے خلاف ہے۔ وہ طبعاً انانیت پسند اور انفرادیت کے مدّاح واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ انقلابی تگ و دو کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور سے اس تگ و دو کا ہیرو کوئی طبقہ نہیں بلکہ فرد ہوتا ہے اور ان کے ابتدائی انقلابی کلام میں یہ ہیرو جوشؔ صاحب خود ہی ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ان کا ایک شعر سناتا ہوں:

ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں

فیضؔ کی تنقید، صاف، رواں اور شستہ نثر کا بھی نمونہ ہے۔ ان کی تنقید سے افہام و تفہیم کے دریچے وا ہوتے ہیں اور ان کی نثر سے ایک خاص طرح کی ذہنی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب چونکہ وہ کوئی سکّہ بند نقاد تو تھے نہیں۔ کہیں کہیں ان کا بے تکلفانہ غیر رسمی لہجہ تحریر کی شگفتگی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ فیضؔ کے تنقیدی مضامین، انہیں باقاعدہ ناقد کا درجہ تو نہیں دیتے لیکن ان کے تنقیدی شعور کی اہمیت سے انکار کرنا ممکن نہیں اور یہ بات خود فیضؔ صاحب نے بارہا مجھ سے بھی کہی کہ۔

''میرے تنقیدی مضامین میں تخن علماء سے نہیں بلکہ عام پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔''

سماجی عمل اور تخلیقی عمل میں ایک بنیادی فرق ہے۔ سماجی عمل بالعموم برسرِ عام اور تخلیقی عمل تنہائی میں ہوتا ہے۔ سماجی عمل کا بنیادی تعلق باہر کی دنیا سے ہوتا ہے اور تخلیقی عمل کا بنیادی تعلق اندر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ سماجی عمل کی سمت پورے سماج کی فلاح و بہبود کی طرف ہوتی ہے یا کم از ہونی چاہیئے جبکہ تخلیقی عمل افراد کے ذریعے سماج کے آہنگ وتوازن کو برقرار رکھنے کی کوشش ہوتا ہے جو سارے انسانوں میں مشترک ہوتی ہے۔ منفرد انسانوں کے روحانی کرب، باطنی احتیاجات، ان کے خوابوں اور وجدان و تخیل کے تقاضوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تخلیقی عمل کا تعلق وجدان و تخیل کے ذریعے موجود صورتِ حال سے ماوراء ہونے اور ناموجود کو تبدیل کر کے نئے عالم کی تخلیق پر مصر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں تخلیقی عمل سماج کے ان مقتدر عناصر کے لیے جو موجود صورتِ حال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ چیلنج بن جاتا ہے۔ سماج کی تخلیق دشمنی اور تخلیقی عمل سے خوفزدگی کا یہی بنیادی سبب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی فیضؔ کا فلسفہ بھی ہے۔ ان کے نزدیک ہر عمل کے پیچھے میلانات، رجحانات اور ان سے پیدا شدہ روّیے موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے اور انہیں تبدیل نہ ہونے دینے کے ہوں تو تخلیق سے خوفزدگی فطری بات ہوگی۔ تخلیقی عمل محض شعروادب یا فنونِ لطیفہ کی تخلیق تک محدود نہیں ہے۔ تخلیقی روّیوں کی کارفرمائی زندگی کے ہر شعبے اور عمل میں ہوسکتی ہے۔ آپ کے چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی کاموں میں بھی یہ روّیے محسوس کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ موجود کو بہتر اور خوبصورت بنا کر اس کی قلب ماہیت کرنے

اور زندگی کو خوبصورتی اور توانائی بخشنے کے لیے ہوں، نیز یہ کہ زندگی کے فطری آہنگ کے مطابق ہوں۔ اس تخلیقی عمل کے دورخ ہوتے ہیں۔ آپ جس قدر حسن، توازن اور آہنگ باہر کی دنیا میں پیدا کریں گے۔ اسی قدر حسن، توازن اور آہنگ آپ کی ذات میں، آپ کے باطن میں پیدا ہوگا۔ تخلیقی عمل کا بنیادی اصول یہی ہے اور اگر آپ اپنی ذات میں، حسن، توازن اور آہنگ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسے زندگی کے عام کاموں میں بھی برتئے۔ لہٰذا تخلیقی عمل کے پیچھے جو روّیے کارفرما ہوں گے، وہ موجود صورتِ حال کو تبدیل اور اس کی قلب ماہیت کرنے والے ہوں ہے۔ آپ کے تخلیقی عمل سے اشیاء اور معروض (جن میں انسان بھی شامل ہیں) موجود صورت کو چھوڑ کر اعلیٰ تر صورت اختیار کرلیں گے اور زندگی کے حسن اور اس کی توانائی میں اضافہ کریں گے۔ جس کی ایک اعلیٰ مثال ہم فیض احمد فیضؔ کی زندگی اور ان کے فن پاروں میں دیکھتے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں امریکا، اسرائیل اور مصر کی باہمی مشاورت سے Camp David معاہدہ طے پایا جس کی رُو سے غزّہ کی مغربی پٹی میں فلسطین کی خودمختار حکومت قائم ہونا تھی لیکن اس معاہدہ پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اس طرح PLO کی جانب سے فلسطین کی خودمختار اور آزاد ریاست کے قیام کی مانگ میں شدّت آ گئی PLO کے چیئرمین یاسر عرفات کی سرگرمیوں میں بجلیاں بھر گئیں۔ اپنے اس حق کے حصول کے لیے انہوں نے ایشیائی اور افریقی ممالک سے روابط قائم کرنا شروع کیے۔ اس ضمن میں پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ ''لوٹس میگزین'' کا صدر دفتر قاہرہ سے بیروت منتقل کیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیضؔ کو بیروت بلا کر اس رسالہ کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کی اور خود بھی اپنے تنظیمی کاموں سے وقت نکال کر رسالہ کی سرپرستی

کرتے رہے۔

ان ہی دنوں ہم نے فیضؔ صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم چیئرمین یاسر عرفات سے ملنا چاہتے ہیں۔

کہنے لگے ٹھیک ہے۔ اگلی بار جب وہ ہمیں ملاقات کے لیے بلائیں گے تو ہم آپ کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

معمول کے مطابق ایک اتوار کو ہم فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔

کہنے لگے: بھئی آنے والے بدھ کو دو بجے یاسر عرفات صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔ یہی رسالے کے سلسلے میں کچھ امور پر بات کرنی ہے۔ اگر آپ اپنی پڑھائی کے دوران یونیورسٹی سے چند گھنٹے نکال سکتے ہیں تو ''ابوعمار'' سے ملاقات کی اپنی آرزو پوری کر لیجئے۔

ہم نے ہامی بھر لی۔ البتہ ایک دشواری تھی، جس کا ہم نے فیضؔ صاحب سے قطعی ذکر نہ کیا۔ ورنہ وہ ہمیں روک دیتے اور وہ یہ کہ بدھ کو ہمارا بہت اہم ٹیسٹ تھا۔ اپنے پروفیسر سے بات کی کہ زندگی میں پہلی بار ہمیں چیئرمین یاسر عرفات سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے اگر وہ ہمیں یہ ٹیسٹ جمعرات کو لکھنے کی اجازت دیدیں تو ہماری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ ''جارج وکٹر'' نہایت شفیق استاد تھے، انہوں نے ہمیں اجازت دیدی۔

مقرّرہ دن، ہم فیضؔ صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ جہاں سے PLO کی گاڑی ہم دونوں کو تنظیم کے ہیڈکواٹر لے گئی۔

شارع الحمراء سے متصل ایک وسیع احاطے میں ایک پرانی سی سفید

عمارت، جس کی چھت سبز کھپریل کی بنی ہوئی ہے۔ احاطے کے گیٹ پر دونوں جانب لکڑی کے کیبن میں دو بندوق بردار مستعد سیکیورٹی گارڈ ہماری گاڑی جب گیٹ پر پہنچی تو کیبن سے ایک پہرے دار برآمد ہوا، جس نے گاڑی کے اندر منہ ڈال کر ہم دونوں کو بغور دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ ڈرائیور نے ہمیں عمارت کے مرکزی دروازے پر اتارا۔ عمارت کے اندر ہماری رہنمائی کرتا ہوا ریسپشن (استقبالیہ) تک لے گیا جہاں بیٹھی ہوئی خاتون کو بتایا کہ یہ لوگ ابوعمار کے مہمان ہیں۔ خاتون سے عزت واحترام کے ساتھ ہمیں بٹھایا اور قہوہ پیش کرتے ہوئے نہایت تہذیبی اور روایتی انداز میں کہا:

ابوعمار کے پاس کچھ لوگ کافی دیر سے بیٹھے ہیں۔ بس اب نکلا ہی چاہتے ہیں۔ آپ قہوہ لیجئے۔ یہ کھجوریں تناول فرمائیے۔ آپ نے یہاں تشریف لاکر ہمیں عزّت بخشی۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ فیضؔ صاحب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔ یہاں تک کہ استقبالیہ پر بیٹھی خوبصورت لبنانی خاتون کو دیکھ کر بھی ان کے مزاج کی حسن پرستی خوابیدہ رہی۔ ہونٹوں پر وہ لطیف مسکراہٹ نہ آئی جوان کی شخصیت کا حصّہ ہے۔

ہم نے آہستہ سے اردو میں کہا:

فیضؔ صاحب یہ کہہ رہی ہے کہ ابوعمار نے آپ کو یہاں سے الجزائر منتقل کرنے کا انتظام کردیا ہے۔ شاید آپ کو کل ہی روانہ ہونا پڑے۔

فیضؔ صاحب نے چونک کر ہمیں دیکھا اور بولے:

مطلب؟

ہم نے عرض کیا:

بیروت کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں نا۔

لیکن یہ کہتے ہوئے ہم اپنی ہنسی کو نہ ضبط کر سکے۔ آخر فیضؔ صاحب بھی ہنس دیئے۔ اور ایک لطیف مسکراہٹ ان کے لبوں پر انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔

کچھ ہی دیر بعد یاسر عرفات اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ برآمد ہوئے۔ جنہیں رخصت کرنے کے بعد ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ علیک سلیک کے دوران فیضؔ صاحب نے ہمارا تعارف کروایا اور کہا کہ یہ ہمارے نوجوان پاکستانی دوست ہیں۔ آپ کو قریب سے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یاسر عرفات نے محبت سے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اھلاً و سھلاً۔ شرّفنا کہتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہوگئے۔

اب یاسر عرفات اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے، فیضؔ صاحب ان کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھے اور ہم ذرا فاصلے سے رکھے ایک صوفے پر۔ ان دونوں کی یہ میٹنگ کوئی تیس منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران ہم وہاں رکھے عربی کے اخبارات اور رسائل دیکھتے رہے۔

یاسر عرفات عمر میں فیضؔ صاحب سے ۱۹ سال چھوٹے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۶۴ء سے بطور کل وقتی انقلابی لیڈر برائے آزادئ فلسطین اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ ۲۴ راگست ۱۹۲۹ء کو قاہرہ میں جنم لینے والے اس مجاہد نے ۱۱ رنومبر ۲۰۰۴ء کو پیرس کے اسپتال میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ وفات سے دس سال قبل یاسر عرفات کو ''نوبل امن ایوارڈ'' ۱۹۹۴ء میں دیا گیا۔

فیض صاحب سے انگریزی میں ضروری بات چیت کے بعد ابو عمار ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ وہ اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ ہم سے عربی میں مخاطب ہوئے۔ اُن دنوں بیروت میں ہمارے قیام کی غرض و غایت سے آ گاہی حاصل کی۔ پوچھا:

بیروت کیسا لگا، آپ کو۔

ہم نے کہا:

ہمارا بیروت آنا جانا تو گذشتہ دس سال سے جاری ہے۔ یہ خوبصورت شہر بلا مبالغہ شرق الاوسط کا پیرس ہے۔

یاسر عرفات کہنے لگے:

فیض صاحب بتا رہے تھے کہ آپ بھی شاعر ہیں۔ میں شعراء کی بہت قدر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے فیض صاحب کا تازہ کلام عربی میں ترجمہ کر کے سنائیں۔

ہم نے فیض صاحب کی جانب دیکھا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے میں اپنی ایک نظم "فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے" سناتا ہوں۔ آپ اس کا عربی میں ترجمہ کر دیں۔

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی

تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
سارے ان دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کُھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعداء نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

نظم کے آخری دو مصرے سن کر یاسر عرفات جھوم اٹھے۔ اسی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کر فیضؔ صاحب کو سینے سے لگالیا۔ ہماری جانب گھوم کر کہنے لگے:

"الاخ زلفی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ فیضؔ صاحب کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدین کے تناظر میں کہی گئی ہیں۔ ان سب کا عربی میں ترجمہ لکھ کر مجھے بھجوادیں۔"

ہم نے کہا:

کیوں نہیں یا ابو عمار! یہ تو ہمارے لیے بیحد اعزاز کی بات ہوگی۔

یاسر عرفات کا یہ ذوقِ شعری دیکھ کر ہم نے جھجکتے ہوئے کہا:

کیا آپ بھی شعر کہتے ہیں؟

بولے:

نہیں، البتہ مجھے شعر بہت یاد ہیں۔

اس دوران فیضؔ صاحب جو ہم دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اردو میں بتایا کہ ابو عمار کو آپ کی نظم بہت پسند آئی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں آپ کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدینِ آزادی کے تناظر میں کہی گئیں ہیں عربی میں ترجمہ کر کے انہیں بھجوادوں، جسے یہ یہاں کے عربی جرائد و مجلات میں شائع کروانا چاہتے ہیں۔

اور یہ کہ۔ انہیں عربی کے بہت سے شعر ازبر ہیں۔

یہ سن کر فیضؔ صاحب نے یاسر عرفات سے درخواست کی کہ آپ بھی اپنی پسند کا کچھ کلام سنائیں۔ زلفی صاحب میرے لیے اس کا اردو ترجمہ کریں گے۔

اب چونکہ ابو عمار موڈ میں تھے اور فیضؔ صاحب کی نظم کا سُرور قائم تھا۔ انکساری سے بولے:

میں خود تو باقاعدہ شاعر نہیں ہوں البتہ کبھی کبھی تک بندی کر لیتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے ان قدیم شعراء کے شعر سنا سکتا ہوں جو زباں زدِ عام ہیں۔ اس سے پہلے یہ بتانا چاہوں گا کہ ہماری عربی شاعری کی تاریخ کوئی ساڑھے پندرہ سو برس پرانی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کی زندہ زبانوں کی شاعری میں اگر یہ سب سے قدیم ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ ہمارے مورخینِ ادب شاعری کی اس طویل روایت کو پانچ ادوار پر تقسیم کرتے ہیں۔ سب سے پہلا دور اسلام سے ذرا پہلے زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا ہے جس کے آثار اگرچہ رسول ﷺ کی بعثت سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے تک ملتے ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے،

عربی شاعری اُس زمانے میں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ادب کے نقادوں کے نزدیک کئی صدیوں تک عربی شاعری کا سب سے اعلیٰ و ارفع معیار وہی رہا ہے جو امرؤالقیس، زہیر اور نابغہ جیسے جاہلی شعراء نے ایک دفعہ قائم کر دیا تھا۔ صدیوں تک عربی شاعری کے دوسرے دور کو صدرِ اسلام اور اموی دور کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام کی آمد کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ اس کے پیغام اور قرآن کریم کی معجزانہ بلاغت کے سامنے عربی شاعری کی گرم بازاری کچھ عرصے کے لیے سرد پڑ گئی اور لوگوں کی توجہ شعر و سخن سے ہٹ کر آیاتِ قرآنی کے حسنِ بیان کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ نبی ﷺ اور ان کے خلفاء کے زمانے میں کچھ ایسی شاعری ضرور ہوئی جو اسلام کی مدافعت اور رسولِ خدا کی مدح میں تھی۔ تاہم اپنے محاورے اور اسلوب میں یہ جاہلی شاعری سے مختلف نہیں تھی۔ بنو امیہ کا عہد شروع ہوتے ہی عربی شاعری میں پھر سے چہل پہل دکھائی دینے لگتی ہے۔ عربوں کے اندر وہ نسلی، علاقائی اور سیاسی و اعتقادی عصبیتیں جو خلفائے راشدین کے زمانے میں دبی رہی تھیں جب رفتہ رفتہ ابھر کر نمودار ہونے لگیں، تو شعراء کی مانگ ہوئی۔ سخنورانِ عرب بادیہ سے نکل کر شہروں کا رخ کرنے لگے اور ہر طرف ان کی ریل پیل ہوگئی۔ اُس عہد میں تین شاعروں، اخطلؔ، فرزدقؔ اور جریرؔ نے بڑا نام پایا، اور اپنی بلاغت و زورِ بیان میں یہ جاہلی شعراء کے ہم پلہ ٹھہرے۔ عربی زبان کی خالصۃً عشقیہ شاعری کے بہترین نمونے بھی اسی عہد میں عمرؔ ابنِ ربیعہ اور جمیل کے کلام میں ملتے ہیں۔ اور مشہورِ عالم رومانی داستان "قیس و لیلیٰ" (لیلیٰ مجنوں) کا قیسؔ بھی اسی زمانے کا ایک حقیقی شاعر ہے۔ عربی شاعری کا تیسرا دور عباسی دور کہلاتا ہے، اسی نام کے سیاسی دور کی طرح یہ بھی کئی صدیوں پر پھیلا ہوا اور حوادث و تغیرات سے پُر

ہے۔ایک بڑی تبدیلی جو اس عہد کے آغاز سے ہی عربی شاعری میں واقع ہونے لگتی ہے، یہ ہے کہ اب شاعری اپنے مزاج میں خالصتہً عربی نہیں رہتی، بلکہ ایرانی اور دوسرے عجمی عناصر کے اختلاط سے اس پر بیرونی اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ شاعری کے مضامین جو پہلے سادہ، سچے اور فطرت کے قریب ہوا کرتے تھے، اب ان میں نفاستِ خیال اور مضمون آفرینی اور شہری زندگی کے اطوار دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر عباسی خلفاء اور امراء کی مدح اور ہجو میں نئے نئے مضامین پیدا کرنے لگتے ہیں۔ اس عہد میں کم از کم بارہ نام صفِ اول کے شعراء کے گنوائے جا سکتے ہیں، جن میں سے بعضوں کا نام آپ ایشیائیوں کے لیے بھی شاید اتنا نامانوس نہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ خاص کر آپ لوگ ہمارے شاعر ابوالعلاء معرّی سے بخوبی واقف ہیں۔(یاسر عرفات اس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ قدیم عرب شعراء کی تاریخ بیان کر رہے تھے کہ کسی تعلیمی ادارے میں لیکچر دے رہے ہوں یا کسی سیمنار سے خطاب کر رہے ہوں) کہنے لگے میں آپ کو زہیؔر کے دو تین شعر سناتا ہوں:

وَمَن لم یذُد عن حوَضہِ بسلاحہِ
یُھدَم و مَم لا یظلم الناس یِظلم

(جو اپنی جان، آبرو کی حفاظت ہتھیار اٹھایا نہیں کرتا، وہ مسمار کردیا جاتا ہے، اور جو دوسروں پر ظلم نہیں کرسکتا وہ خود ظلم کا نشانہ بن جاتا ہے)

ومَن یَغترب یحسب عَدواً صدیقۃَ
ومن لایکرم نفسَہ لا یکرمِ

(جو شخص اغیار سے رشتہ جوڑتا ہے، وہ گویا دشمن کو دوست سمجھتا ہے۔
اور جو اپنی عزت نہیں کرتا، دنیا اس کی بھی عزت نہیں کرتی)

و من یجعل المعروف فی غیرِ اھلہِ
یکُن حمدہ ذمّا علیہ و یندَمِ

(جو شخص کسی ایسے آدمی پر احسان کرتا ہے جو اس کا اہل نہیں ہوتا۔ تو اس کا یہ قابلِ تعریف فعل اس کے لیے مذمت بن جاتا ہے۔ اور وہ اس پر ایک دن نادم ہوتا ہے)

یاسر عرفات کی زبانی زہیر کا یہ شعر سن کر ہم نے عرض کیا:

یا ابو عمار! اسی تناظر میں کسی دانا کا قول بھی تو ہے، تمہیں سب سے زیادہ خبردار اُس شخص سے رہنا چاہیئے جس پر تم نے احسان کیا ہو۔ اس لیے کہ ایک دن وہ تمہیں ضرور ڈسے گا۔

ابھی ہم لوگوں کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ استقبالیہ پر بیٹھی خاتون نے آ کر بتایا:

''یا ابو عمار! آپ کے کچھ اور ملاقاتی باہر بیٹھے باریابی کے منتظر ہیں۔''

یہ سن کر ہم نے فیضؔ صاحب کو اشارہ کیا اور ہم دونوں نے قہوہ کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے یاسر عرفات صاحب سے اجازت طلب کی۔ وہ ہمیں حسب روایت استقبالیہ کے دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ فیضؔ صاحب سے چند باتیں کیں۔ ہمیں عربی ترجمہ بھیجنے کی تاکید کی اور پھر اپنے دوسرے ملاقاتیوں میں گھِر گئے۔

یاسر عرفات سے اس یادگار اور متاثر کن ملاقات پر ہم بہت خوش تھے۔
واپسی پر راستے میں فیضؔ صاحب نے بھی ابو عمار کی ذہانت کی بیحد تعریف کی۔

فیضؔ صاحب نے عربی ادب میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔
کہنے لگے: بھئی ہمیں عربی بولنے کی پریکٹس نہیں۔ سمجھ اچھی طرح لیتے ہیں۔ اب سے پہلے جب بھی یاسر عرفات صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے ہمیشہ ہم سے انگریزی میں بات کی اور شعر و ادب کے موضوع پر کبھی اظہارِ خیال نہ کیا لیکن آج آپ کی وجہ سے انہوں نے عربی میں جس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ عرب شعراء کا ذکر کیا ہے، وہ سن کر دل خوش ہوا۔

شاید یہی وہ لمحہ تھا، جب فیضؔ صاحب نے طے کیا ہو کہ ''جلاوطنی کے اس دوسرے پڑاؤ'' کی تمام شاعری کو ''ابو عمار یاسر عرفات'' کے نام معنون کریں گے۔ اور جب جلاوطنی کے زمانے کی وطنیہ شاعری کا مرقع فیض احمد فیضؔ کا ساتواں شعری مجموعہ ''مرے دل مرے مسافر'' منصۂ شہود پر آیا تو ہم نے دیکھا کہ۔ یاسر عرفات کا نام اس پر جگمگا رہا تھا۔

قیامِ بیروت کے چار سال کے دوران گو کہ فیضؔ صاحب دنیا بھر کے علمی، ادبی اور سماجی اداروں کی دعوت پر تسلسل کے ساتھ آتے جاتے رہے لیکن ہمارا ملنا جلنا، ان کے بیروت میں ایامِ اقامت ہی میں رہا۔ اسی طرح یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ یونیورسٹی میں چھٹی تھی۔ ہم فیضؔ صاحب کے دفتر جا دھمکے۔

وہ ہمیں یوں اچانک دفتر میں دیکھ کر قدرے حیرانی سے بولے: کیوں بھئی آج یونیورسٹی نہیں گئے!

ہم بتایا کہ آج چھٹی تھی تو سوچا آپ کو پریشان کیا جائے،

کہنے لگے:

اچھا کیا جو آ گئے۔ ہمارا بھی آج کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔

ہم نے کہا:

آیئے آج آپ کو "الحمراء کافی ہاؤس" کی کافی پلاتے ہیں۔

کافی ہاؤس کی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد فیضؔ صاحب گویا ہوئے۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی دو ہفتے پہلے آپ نے ہمیں ایک مقامی اخبار لا کر دیا تھا جس میں غزہ کی حالیہ اسرائیلی بمباری میں مرنے والوں میں شامل ایک ایسی فلسطینی عورت کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش کے سینے سے چمٹا اس کا دو سالہ زندہ بچہ رو رہا ہے۔"

"جی" میں نے اُس تصویر کا سوچ کر، کرب سے کہا۔

فیضؔ صاحب نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولے:

ہم نے اُسی فلسطینی بچے کے لیے ایک نظم "فلسطینی بچے کے لیے لوری" ابھی مکمل کی ہے۔ وہ آپ کو سناتے ہیں:

مت رو بچے

رو رو کے ابھی

تیری امّی کی آنکھ لگی ہے

مت رو بچے

کچھ ہی پہلے

تیرے ابّا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچّے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی کے پیچھے
دُور کہیں پردیس گیا
مت رو بچّے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے
مت رو بچّے
تیرے آنگن میں
مُردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچّے
امّی، ابا، باجی، بھائی،
چاند اور سورج
روئے گا تو اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مُسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر

تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

نظم سننے کے بعد اُس وقت جو ہماری جو کیفیت ہوئی۔ کرب کے اُن لمحات کو یاد کر کے اِس وقت بھی ہم پر وہی کیفیت طاری ہے۔ اندازہ کیجئے اُس تخلیق کار کے دل پر کیا گزری ہوگی جس نے یہ نظم تخلیق کی۔

ہم نے فیضؔ صاحب کو یاد دلایا کہ یاسر عرفات صاحب نے ہمیں پابند کیا ہے کہ فلسطین، فلسطینیوں اور فلسطین کے مجاہدین سے متعلق فیضؔ صاحب کا تمام کلام عربی میں ترجمہ کر کے انہیں بھجواتے رہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کی یہ پُر اثر نظم ہمیں ترجمہ کر کے انہیں فوراً بھیجنی چاہیئے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ نظم ہمیں لکھوا دیں تا کہ اس کا عربی ترجمہ ہم ابو عمار کو بھیج دیں۔ فیضؔ صاحب نے اس بات کو پسند فرمایا اور نظم ہمیں لکھوادی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں آپ کہیں بھی جائیں وہاں آپ کو کچھ پاکستانی ضرور آباد ملیں گے یا نظر آئیں گے لیکن پھر بھی چند ایسے ممالک ہیں جہاں آپ کو شاید پاکستانی کبھی کبھی نظر تو آجائیں لیکن آباد نہیں ملیں گے۔ ان ممالک میں اسرائیل، فلسطین اور لبنان وغیرہ شامل ہیں۔ خاص کر ہم جو ۳۲ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں جب فیضؔ صاحب وہاں مقیم تھے۔ اُس زمانے میں تو اِکا دُکا پاکستانی بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اس بات سے آپ فیضؔ صاحب کی تنہائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ البتہ بیروت میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ ضرور مقیم تھا لیکن ظاہر ہے وہ لوگ فیضؔ صاحب کو جاننے، ماننے اور قدر دان ہونے کے باوجود ان سے ملاقات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ہر کسی کو اپنی ملازمت پیاری تھی! اس تمام صورتِ حال کے

باوجود اگر کوئی ذمہ دار پاکستانی ڈپلومیٹ سفارت کار، خاموشی سے فیضؔ صاحب کی قیام گاہ پر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ حاضری دے تو حیرت تو ہوتی ہی ہے!!
یہی حیرت ہمیں اُس وقت ہوئی جب ہم معمول کے مطابق فیضؔ صاحب کے فلیٹ میں بیٹھے کسی موضوع پر اُن کے خیالات سے مستفید ہو رہے تھے، اچانک بیل ہوئی۔ بیگم فیض نے دروازہ کھولا تو اپنے دروازے پر پاکستانی سفارت کار چوہدری اقبال احمد گوندل کو بریف کیس کے ساتھ کھڑا پایا۔ اور وہ انہیں اندر لے آئیں۔ اندر پہنچ کر وہ فیضؔ صاحب سے گلے ملے۔ ہم سے ہاتھ ملایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

رسمی مزاج پرسی کے بعد فیضؔ صاحب نے دریافت کیا:

بھئی خیر تو ہے۔ کیسے آنا ہوا۔

کہنے لگے۔

سر! ہماری طرف سے تو خیر ہی خیر ہے۔ سرکاری ملازم ہیں اور حکومتِ وقت کے تابعدار بھی لیکن ذاتی حیثیت میں آپ کے قدردان اور مداح ہیں۔

یہ سن کر فیضؔ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔

گوندل صاحب نے اپنے بریف کیس سے اپنا نومطبوعہ انگریزی ناول Ashes and Embers (راکھ اور انگارے) پیش کیا۔

کتاب دیکھ کر فیضؔ صاحب بولے:

اچھا۔ ہاں۔ یہ مجھے بذریعہ ڈاک بھی مل چکا ہے۔ شاید آپ ہی نے بھجوایا تھا۔

وہ بولے:

جی سر! کیسا لگا آپ کو میرا یہ ناول؟

فیض صاحب نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے صوفے پر پہلو بدلا اور ہنستے ہوئے بولے۔

جناب آپ نے facts اور fiction کا قیمہ بناتے وقت تکنیکی لا علمی کی ہڈیوں کا چورہ بھی ملا ڈالا۔ بھائی! فکشن اور وہ بھی اُس ملک اور قوم کی زبان میں جس کے درمیان آپ رہے بھی نہیں جس کے کلچر اور جذبات سے آپ بالکل بے بہرہ ہیں۔ گوندل صاحب! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ضرور ہے لیکن اردو میں لکھیں جو آپ کی قومی زبان ہے۔ ورنہ پنجابی میں لکھیں، جو آپ کی مادری زبان ہے۔ انگریزی ادب آپ کے اس ناول کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کے بارے میں آپ نے قیامِ پاکستان سے قبل انگریزی میں جو معلوماتی کتاب لکھی تھی اُس کی بات اور تھی۔ لیکن یہ انگریزی ادب آپ کے بس کا نہیں۔

فیض صاحب کی اس صاف گوئی کے سبب گوندل صاحب کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ اصل میں وہ اگر اکیلے ہوتے تو کوئی بات تھی۔ ہماری موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ پریشان تھے۔ ہم نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فیض صاحب سے رخصت چاہی۔

فیض صاحب نے یہ کہتے ہوئے:

بھئی گوندل صاحب ہمارے پرانے کرم فرما اور عزیز دوست ہیں اور یہ

سب دوستی کی باتیں ہیں۔ آپ بیٹھیں اور پریشان نہ ہوں۔ اتنے میں چائے آ گئی اور موضوع بدل گیا۔

اپنے قیامِ بیروت کے دوران ہی فیض صاحب ۱۹۷۸ء کے اواخر میں پہلی بار کینیڈا بھی تشریف لائے تھے۔ ایک دن کہنے لگے: بھئی آپ تو اپنی سالانہ تعطیلات میں ہر سال مہینے بھر کے لیے کینیڈا جاتے رہتے ہیں۔ ذرا وہاں کا کچھ ادبی احوال تو سنائیے۔

ہم نے عرض کیا۔ فیض صاحب وہاں ٹورونٹو میں گذشتہ دس سال سے آپ کے دوست پروفیسر عزیز احمد صاحب علم و ادب کی شمع جلائے ہوئے ہیں اور پروفیسر حفظ الکبیر قریشی صاحب نے ان کی سرپرستی میں ''انجمنِ اردو کینیڈا'' قائم کی ہوئی ہے جس کے زیرِ انتظام ماہانہ ادبی نشستوں کے ساتھ ساتھ ہند و پاک مشاعروں اور کانفرنسوں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ قریشی صاحب نے مجھے اپنی انجمن کا اعزازی سیکریٹری بھی بنایا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب آپ یہاں مستقل قیام کے لیے آ جائیں گے اور عملی طور پر ہمارے ادارے کو وقت دیں گے تو یہ ذمہ داری باقاعدہ طور پر آپ کو سونپ دی جائے گی۔

فیض صاحب کہنے لگے:

بھئی یہ تو اچھا ہو جائے گا۔ آپ جیسے فعال اور باصلاحیت نوجوانوں کو وہاں ضرور جانا چاہیے۔ اس طرح ہمارا وہاں بھی ایک ٹھکانہ ہو جائے گا۔

ہم نے عرض کیا:

خیر ابھی تو نہیں۔ جب ہمارے بچے سمجھدار ہو جائیں گے تو عصری

تقاضوں کے تحت، ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہم ضرور کینیڈا جا بسیں گے۔

تب ہی ہم نے انہیں بتایا کہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو جانے کے سبب اِن دنوں عزیز احمد صاحب کی صحت بالکل جواب دے چکی ہے۔ یہ بات سن کر فیضؔ صاحب فکر مند ہو گئے اور دیر تک ان کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔

اِس بات کا ہمیں ہمیشہ ملال رہے گا کہ فیضؔ صاحب کی زندگی میں ہم مستقل قیام کے لیے کینیڈا نہ آ پائے اور اُن کی خواہش کے مطابق یہاں اپنے گھر کو ان کا "ایک اور ٹھکانہ" بنانے سے محروم رہ گئے۔ ہمیں رشک آتا ہے، کراچی کی آمنہ مجید ملک پر، اسلام آباد کی سرفراز اقبال پر، لاہور میں ندرت الطاف پر، ملتان میں عفت ذکی پر اور لندن کی زہرہ نگاہ پر کہ جن کے آشیانے فیضؔ صاحب کا ٹھکانہ ہُوا کرتے تھے۔ یا حسرتی!

اُن ہی دنوں فیضؔ صاحب نے بتایا کہ دہلی سے کملیشور صاحب کا خط اور اندر گجرال صاحب کے حوالے سے بھیشم ساہنی صاحب کا تار ملا ہے۔ کچھ ڈی سی ایم مشاعرہ کا سلسلہ بھی ہے۔ اپنے، اردو، فارسی ادب کے تحقیقی کام کی تکمیل کے لیے چند روز کے لیے ویسے بھی ایک بار پھر دہلی جا رہے ہیں' جہاں سے واپسی پر ماسکو ہوتے ہوئے، بیروت لوٹ آئیں گے۔ لیکن دہلی پہنچنے پر انہیں، اُن کے لاہور کے پتے پر ٹورونٹو سے بھیجا ہوا دعوت نامہ ملا۔ وہ ماسکو سے بیروت آنے کی بجائے ٹورونٹو چلے گئے۔

ہم دیکھتے تھے کہ فیضؔ صاحب، جب کسی ملک کا دورہ کر کے واپس آتے تھے تو قدرے تازہ دم ہوا کرتے تھے۔ اس مرتبہ ان کے کینیڈا اور امریکہ کے دورے سے واپسی پر ہمیں ان میں وہ تازہ دمی نظر نہ آئی۔ آزردگی زیادہ نظر آتی تھی۔

آخرایک دن باتوں کے دوران ہم نے پوچھا:

فیضؔ صاحب! کیابات ہے۔ان دنوں آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگتے ہیں؟

کہنے لگے: Camp David کا معاہدہ ہوئے کتنے مہینے ہوگئے ہیں لیکن بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔یاسر عرفات بہت پریشان ہیں، ان کی کچھ چلتی نہیں ہے۔ فلسطین کے نہتے عوام پر اسرائیل کی جارحانہ کاروائیوں میں شدّت آ گئی ہے۔ جیسا کہ یہاں آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ کی شہ پر اب اسرائیل کے بمبار طیارے لبنان کی سرحدوں کو پھلانگ کر بیروت تک پر ایک آدھ بمب گرا جاتے ہیں۔ میں فلسطین کے مستقبل سے بہت مایوس ہو چکا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ تیس چالیس سال تک بھی ایک آزاد فلسطین ریاست قائم ہو پائے گی۔ تمام مغربی دنیا کی ہمدردیاں صرف اسرائیل کے ساتھ ہیں۔

ہم نے فیضؔ صاحب سے پوچھا: اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

کہنے لگے: کاش اب بھی عرب ممالک عقل کے ناخن لیں اور سویت یونین سے اپنے تعلقات استوار کریں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں، صرف سویت یونین ہی ایک ایسی سپر پاور ہے جو دولت مند عربوں کو تحفظ اور فلسطینیوں کو ایک آزاد ریاست دلوا سکتی ہے۔ اس ضمن میں، ہم نے یاسر عرفات صاحب سے بھی بات کی تھی لیکن وہ کہتے ہیں کہ عرب کسی لادین قوم و ملک سے تعلقات قائم کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔

قیامِ بیروت کے دوران فیضؔ صاحب کو دنیا میں آنے والے تغیرات کا احساس شدّت اختیار کر رہا تھا۔ انہیں اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے

نظریاتی نصب العین کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں ہے، جتنی ابھی حال ہی میں معلوم ہوتی تھی۔ بے شک ان کے لیے یہ ایک بڑا المیہ تھا۔ ان کی شاعرانہ حس کو پیغمبرانہ بصیرت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ فیضؔ نے تو ان واقعات کی گویا پیش بینی کی تھی جن کا خیال اُس زمانے میں کسی سوویت کو خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ فیضؔ کی بصیرت اور ان کے تشویشناک احساسات، ان کے اشعار کے کبھی سوالیہ اور کبھی شک وشبہ کے لہجے میں اور کبھی المیائی کیفیت میں ظاہر ہوئے۔ فیضؔ کے آخری دور کے کلام کا رنگ ایسا گہرا انفرادی رنگ ہے، جو خود ان کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔ اُن ہی دنوں فیضؔ صاحب نے ایک نظم ''پھول مُرجھا گئے ہیں سارے'' کہی تھی:

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں ہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بُجھ کے سو گئی ہیں
اور ان بادلوں کے پیچھے
دُور اِس رات کا دُلارا
درد کا ستارا
ٹمٹما رہا ہے
مسکرا رہا ہے

اور یہی وہ موڑ ہے کہ جہاں سے ایک راستہ مصالحت کی طرف اور دوسرا احتجاج کی طرف جاتا ہے۔ ہمارا شاعر مصالحت کو نیک عمل نہیں جانتا کہ ایسے میں وہ اپنے آپ اور اپنے لوگوں سے غدّاری کا مرتکب ہوگا۔ وہ احتجاجی روّیے اختیار کرتا ہے ظلم کے خلاف، ان لوگوں کے خلاف جو معاشرے کے سارے کے سارے کاروبار کو اپنے اندازے سے چلانا چاہتے ہیں، جو ملک کی تمام صنعتوں پر قابض ہیں، جو کوٹھیوں، کاروں کی طرح انسانی جسم بھی اپنی قوتِ خرید میں رکھتے ہیں۔ اور اپنی مرضی سے انسانی محنت کے معاوضے کا تعین کرتے ہیں۔ حکومتیں ان کی ہیں، قانون میں ترامیم کرنے کا حق انہیں حاصل ہے، علم کی روشنی ان کی قید میں ہے۔ انہوں نے تمام اصول، تمام قوانین اور تمام عقائد اپنی مرضی سے متعین کیے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ سبھی ان پر عمل پیرا ہوں۔ شاعر ان تمام احکامات، قوانین اور معاشرے کے اس تشکیل کردہ نظامِ حیات کو اپنے ذہن کے مطابق نہیں پاتا، تو ان استحصالی قوتوں سے نبرد آزمائی کی جسارت کرتا ہے۔ ان شخصیتوں کی نشان دہی کرتا ہے جو معاشرے میں تبدیلیوں کے خلاف ہیں کہ اس ردّوبدل سے ان کے بنائے ہوئے اصول اور نافذ کردہ احکامات کی عمارت پل بھر میں زمیں بوس ہوجائے گی۔ شاعر کے ان نظریات سے ان کو کوئی تعرّض نہیں ہوسکتا، اگر ادیب وشاعر اپنی آزادیٔ فکر اُن کے قول وفعل تک محدود رکھیں یا پھر وہ غیر جانب دار رہیں۔ سب کچھ دیکھتے جائیں اور کچھ نہ کہیں لیکن اگر وہی شاعر اس نظام کو بدلنے اور اس کی جگہ ا ایک متوازن معاشرے کا مطالبہ کر بیٹھیں تو پھر ان کی یہ سوچ، ان کا یہ اندازِ فکر اور ذہن کی رسائی ان مقتدر شخصیتوں کو ناگوار گزرے گی کہ ان کی نازک طبیعتیں تو وہ بات بھی ناگوار محسوس کرتی

ہیں جس کا ذکر سارے فسانے میں نہ تھا۔ وہ ان باتوں کو کیوں کر نظر انداز کر سکیں گے جن کی نشان دہی برسرِ عام ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ خود شاعر کس ذہنی سطح پر ہے، اگر وہ ان مقتدر شخصیتوں کو خود سے قریب تر پاتا ہے، اسے اس نظام اور اس نظام کو تشکیل دینے والے افراد سے کوئی گلہ نہیں ہے، وہ ان سے متفق ہے کہ عوام کو سیدھا رکھنے کے لیے یہ تمام پابندیاں ضروری ہیں، تو وہ خود کو محصور نہیں پاتا، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کھلی فضاء میں سانس لے رہا ہے، اس پر کوئی بے جا پابندی نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس نظامِ حیات کو ناپسند کرتا ہے، اس میں تبدیلی لانا چاہتا ہے، لیکن اختیارات نہ ہونے کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتا اور اگر کرنا ہی چاہے تو خود کو پابند پاتا ہے۔ ذاتی طور پر اسے یہ زیست گوارا نہیں۔ وہ اس کے خلاف لکھنا چاہتا ہے۔ جاگیر دار طبقے اور حکمراں جماعت کی ہاں میں ہاں ملانا، اس کے نزدیک کفر کا درجہ رکھتا ہے، جب کہ بااختیار طبقہ اپنی ہر بات کو حکم کا اور ہر حکم کو قانون کا درجہ دیتا ہے۔ نتیجتاً شاعری کی حق گوئی انہیں اشتعال دلا سکتی ہے۔ اور ہر شاعر حق گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہے۔ وہ اس دنیا میں چہار جانب پھیلی ہوئی سچائیوں کے انتظار میں ہے۔ محبت و چاہت کا متلاشی ہے۔ وہ جب ظلم و ناانصافی کے خلاف بات کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس کا دل دکھتا ہے ان حالات پر۔ انسان کو انسان پر ظلم کرتے دیکھتا ہے تو اس پر نوحہ کناں ہوتا ہے۔ اس کے نوحے کبھی تو کرب انگیز لہجہ اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی انقلابی اور فیضؔ کی تمام شاعری اس کی زندہ مثال ہے۔

فیضؔ کی شاعری حسن و صداقت کی تلاش کا نام ہے۔ وہ ظلم و ناانصافی، غلامی و انسانی عدم مساوات، محنت کشوں کے استحصال اور سامراجی قوتوں کے مظالم

کے خلاف اس لیے تھے کہ یہ تمام عناصر زندگی کا حسن مٹانے اور اسے بدصورت بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انھی منفی رجحانات سے حسن وصداقت کی اقدار مجروح ہوتی ہیں۔ جب کہ فیضؔ اس معاشرے کے لیے ایک مثبت انقلاب کے خواہاں تھے۔ فیضؔ کے ان انقلابی خیالات نے کبھی گھن گرج کی شکل اختیار نہیں کی، بلکہ بڑے نرم، ملائم انداز میں وہ ایک بڑی اور کڑوی بات کہہ جاتے تھے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ذائقہ ان کے اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے، کہ جہاں مزدور وکسان دن بھر کی محنت اور لہلہاتی فصلوں کے باوجود اپنے کھیتوں، کھلیانوں سے اپنے لیے صرف بھوک ہی حاصل کر پاتے ہیں کہ ان کی ساری محنت وڈیروں کی تجوریوں میں بند ہونے کے لیے ہی ہے۔ دراصل فیضؔ کی شاعری اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ فیضؔ نے اپنی غزلوں، نظموں کو اپنے عہد کے حالات سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ فیضؔ کی سامراج سے نفرت ان کے اشعار سے عیاں ہے۔ سرمایہ داری وجاگیرداری، غلامی ومحکومی، چند انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کی پامالی اور سفاکانہ استحصال اور جبر وظلم سے نفرت فیضؔ کی شاعری کا مطمحِ نظر ہے۔ جہاں اتنی ساری نفرتیں اکٹھی ہوں وہاں سوائے تلخی، غصے، گھن گرج اور چیخوں کے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ان تمام نفرتوں پر چوں کہ فیضؔ کی محبت غالب آ گئی ہے۔ بنی نوع انسان سے محبت۔ اس لیے ان کی شاعری میں ان منفی عناصر کی نشان دہی کے وقت بھی کہیں شور، ہنگامہ نہیں ہوتا کہ فیضؔ کی شاعری لفظوں میں نہیں، اثرات میں، اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ فیضؔ کے ہونٹوں سے نکلی سرگوشی سننے والے کے باطن میں میں قیامت برپا کر دیتی ہے۔ فیضؔ ایک معاملہ فہم، حالات کا صحیح تجزیہ کرنے والے انسان تھے۔ ان کا ایک واضح نقطۂ نظر اور اندازِ فکر

تھا۔ اس اندازِ فکر کو انہوں نے اپنے شعروں میں بیان کیا ہے۔ وہ معتوب ٹھہرے، باغی کہلائے، انقلابی ذہنیت نے انہیں کبھی اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کی ترغیب نہ دی۔

اگر اس تناظر میں دیکھا جائے تو غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد فیضؔ ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو آفاقیت کی حدوں کو پار کر گئے ہیں۔ بہت سے نقادوں نے غالبؔ اور اقبالؔ سے فیضؔ کی فکری مماثلتوں کے حوالے سے تقابلی مطالعے کیے ہیں اور کئی درست نتائج بھی نکالے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے مقابلے میں فیضؔ کا ایک الگ شعری اور فکری نظام ہے۔ ان کا اپنا، زبان، اسلوب اور صوتیاتی و نظریاتی مکتبِ فکر ہے جس کا اظہار خود انہوں نے میرے سامنے بارہا کیا ہے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسرں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر، حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اُس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ شعر و فن اور حیاتِ انسانی پر اس کے اطلاق کے سلسلے میں فیضؔ صاحب کی یہ وضاحت، ان کی شاعری کے مطالعے اور اس کے مندرجات کو سمجھنے میں سہولت پیدا کرتی ہے۔

دورانِ گفتگو اُسی لمحے ہمارے ذہن میں ایک خیال اُبھرا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں فیضؔ صاحب سے ان کی زبان زدِ عام شاعری کی مقبول ترین اور خود ان کو بہت زیادہ پسند نظموں اور غزلوں کے حوالے سے ان کی رائے معلوم کر لی جائے۔

جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے: بھئی جہاں تک نظموں کا تعلق ہے تو جب

۱۹۴۱ء میں ہمارا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' شائع ہوا تو اُس کی چھ سات نظمیں بیحد مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں ''دستِ صبا'' ۱۹۵۶ء میں ''زنداں نامہ'' ۱۹۶۵ء میں ''دست تہِ سنگ'' ۱۹۷۱ء میں ''سرِ وادیٔ سینا'' اور اب ۱۹۷۸ء میں ''شامِ شہریاراں'' کا سب ہی کلام پسند کیا گیا اور ہمیں بھی اطمینان بخشتا ہے۔

''مرے دل مرے مسافر'' کی تمام شاعری، غریب الوطنی، تنہائی اور فیضؔ صاحب کی فکری شکست و ریخت کی تصویر ہے، جس کے وجود میں آتے ہی ہم فیضؔ صاحب کے منہ سے سن چکے تھے اور اپنے پاس نوٹ بھی کرتے رہنے کے معتقدانہ عمل کے طفیل بار بار پڑھتے بھی رہتے تھے۔ بیروت کی اُن ہی ملاقاتوں کی مناسبت اور یادداشتوں میں، اُس عرصے کا بیشتر کلام ہم اِس کتاب میں جگہ جگہ درج بھی کرتے آ رہے ہیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ''مرے دل مرے مسافر'' کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آ چکی تھی اور اُن دنوں فیضؔ صاحب لندن (انگلینڈ) میں مقیم تھے اور اکثر ''اردو مرکز'' میں افتخار عارف صاحب کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اُن ہی دنوں جب ہمارے دوسرے شعری مجموعے ''دستاویز'' کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو ہم ایک ''ویک اینڈ'' پر جدّہ سے لندن گئے اور فیضؔ صاحب سے درخواست کی کہ ''دستاویز'' کے لیے ابھی کچھ لکھ دیجئے۔

کہنے لگے: ''اِس وقت تو ہم ''مہرِ دو نیم'' (افتخار عارف کا پہلا شعری مجموعہ) کے لیے لکھ رہے ہیں۔''

ہم نے عرض کیا: ہماری کتاب پریس جانے کے لیے تیار ہے۔ فی الحال

فلیپ کے لیے ہی چند لائینیں لکھ دیجئے۔ فیضؔ صاحب نے اپنا رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور لکھا:

''تسلیم الٰہی زلفی کی شاعری ان کے عہد کی نمائندہ شاعری ہے لیکن لب و لہجہ یہ وہی اختیار کرتے ہیں جو ان کی مجلسی گفتگو کا ہوتا ہے، اسی لیے ان کا ہر شعر انفرادیت لیے ہوتا ہے۔ لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں، لیکن اپنے گرد و پیش پر ان کی نظر گہری ہے۔ اب بھلا ایسے تازہ دم شاعر سے، اس کے مستقبل میں کیا کچھ توقع نہیں رکھی جاسکتی''۔ (اقتباس)

ایک دن ہم فیضؔ صاحب کو ''الحمراء'' کی کافی پلانے لے جارہے تھے۔ ہماری کار میں لبنان کی مشہور اور مقبول ترین مغنیہ فیروزؔ کی کیسیٹ بج رہی تھی۔ فیضؔ صاحب اُس کی آواز کو غور سے سُنتے رہے۔

کہنے لگے: بھئی ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے اپنی ناہیدؔ نیازی کوئی عربی گانا گا رہی ہیں۔

ہم نے عرض کیا: جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ فیروزؔ کی آواز ناہیدؔ نیازی سے بہت ملتی ہے۔ جب فیروزؔ نے محمود درویش کا لکھا اپنا مشہور نغمہ گایا:

لا جلكى يا مدينة السلام
يا قدس يا مدينة السلام
لم يقفل باب مدينتنا
انا ذاهبه لاصلى
افتح الابواب
القدس لنا

البیتُ لنا

للقدسُ سلام

للقدسُ سلام۔

(تیرے لیے اے سلامتی کے شہر قدس! تیرے لیے۔ اے ظالمو! ہم پر اِس شہر کے دروازے بند نہ کرو۔ دروازے کھولو کہ میں نماز پڑھنے جارہی ہوں)

بیت المقدس کے لیے فیروز نے یہ نغمہ اتنے جوش، جذبے اور ولولے سے گایا ہے کہ اسے سن کر فیض صاحب پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔

کہنے لگے:

زلفی اسے پھر لگائیں۔

کیسیٹ Rewind کی اور محمود درویش کا وہی پر جوش نغمہ ایک بار پھر ہماری روحوں کو بالیدہ کرنے لگا۔

اُس کے بعد جب جب فیض صاحب ہماری گاڑی میں بیٹھے ہر بار فیروز ہی کی کیسیٹ بجانے کی خواہش کا اظہار فرمایا فیروز کے دیگر اغنیات کو سُن کر بھی وہ اس کی آواز کی نرمی اور مٹھاس سے بیحد محظوظ ہوتے تھے۔

فیض صاحب کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے انہیں بتایا کہ اگلے اتوار کو فیروز کا کنسرٹ ہے اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو لے چلیں۔

کہنے لگے:

بھئی ضرور۔ ہم تو دل و جان سے جائیں گے۔

ہم انہیں فیروز کے کنسرٹ میں لے گئے۔ دو گھنٹے کے اس کنسرٹ کو فیض صاحب نے اتنی دلچسپی اور توجہ سے سنا کہ ہم بھی نہال ہو گئے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ فیروز نے گانے کا آغاز ہی یا قدس یا مدینة السلام سے کیا۔ چونکہ اُن دنوں فلسطینیوں پر اسرائیل کی چیرہ دستیاں اپنے عروج پر تھیں۔ بیت المقدس میں فلسطینیوں کا داخلہ تقریباً بند تھا اس لیے فیروز کا یہ نغمہ سن کر پورا ہال پُر جوش نعرے لگاتا رہا جس میں وہاں کے عیسائی لبنانی بھی شامل تھے۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ جس طرح، یہودی مسلمانوں کو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور وہاں عبادت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اُسی طرح عیسائیوں کے داخلے، زیارت اور عبادت کرنے پر بند کتے تھے۔ فیروز کے اس پُر جوش نغمے یا قدس یا مدینة السلام کو سن کر ان پر بھی وہی اثر ہُوا جو بیروت کے مسلمانوں پر۔

ایک طرف تو بیروت کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے، دوسرے بیگم فیض کو اپنا گھر، دونوں بیٹیاں اور نواسے، نواسیاں بہت یاد آ رہے تھے۔ فیض صاحب نے ان سے کہا کہ مناسب ہے کہ اب آپ پاکستان چلی جائیں۔ اتفاق سے اُن ہی دنوں ہمارا بھی اپنی سعودی ائرلائنز کی کسی Aircraft GSE Maintenance میٹنگ کے سلسلے میں جدّہ سے بیروت جانا ہوا۔ ہمیں دیکھ کر بیگم فیض بہت خوش ہوئیں۔

کہنے لگیں:

"فیض مجھے پاکستان بھیج رہے ہیں لیکن میں نے بھی اِن سے کہہ دیا ہے کہ میں آپ کو زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کا وقت دے رہی ہوں کہ آپ اپنے سارے

کام نبٹا کر گھر واپس آ جائیں۔ زلفی! آپ تو دیکھتے ہیں کہ یہاں بیروت میں ہمارا کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی مددگار نہیں ہے۔ کوئی ملنے جلنے والا نہیں ہے۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے جو فیض کی "بے بی سٹنگ" کر سکے۔ مجھے بچوں کی طرح ان کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ ان کا ذہن تو ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ اِن دنوں ان کی خود فراموشی اپنے عروج پر ہے اگر میں وقت پر ان کے آگے کھانا نہ رکھوں تو یہ محض سگریٹ اور شراب پر ہی شاکر رہیں گے۔ اپنے منہ سے کبھی نہیں کہیں گے کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ جب میں یاد دلاتی ہوں کہ آپ کچھ کھا لیجئے۔ تو کہتے ہیں۔ اچھا دے دو"۔

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فن کار دنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں، لیکن وہ دوسروں سے اس لیے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاری کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا لیکن ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی ذمّہ داری دراصل ہمارے معاشرے پر ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوّری سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، لیکن فن کار یا شاعر کی ذات سے نہیں۔ فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے، اس لیے وہ اِس دنیا کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اپنے گھر بار اور روزمرّہ کی ضرورتوں کی پروا نہیں رہتی۔ اسے ایسے رفقاء کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ ہفت خواں منازل اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصوّر یا مصنّف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کارِ دنیا تمام ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصنّفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے

دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں، کیونکہ وہ نہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔!

ان تمام دھڑکوں کے ساتھ آخر ایلس پاکستان چلی گئیں۔

ایفروایشیائی مصنفین کی تحریک جس کی باگ ڈور اور تحریک کے اخراجات ماسکو کے ہاتھ میں تھے لیکن ایک وقت آیا جب ان میں کافی گڑ بڑ ہونے لگی۔ نتیجتاً تحریک بے قابو ہونے لگی۔ نو آزاد ممالک کے قومی اغراض ومقاصد ماسکو کے نظریات سے ٹکرانے لگے جو ماسکو کے لیے قطعی ناقابلِ قبول تھا۔ اِدھر فیض جو فطرتاً امن پسند انسان تھے، ان پر اِن بحثوں، جھگڑوں اور تنازعات کا بہت بُرا اثر پڑتا تھا۔ وہ سوویت نظام کی نوکر شاہانہ دیوارں سے ٹکرانے لگے کیونکہ وہ سوویتی حکمرانہ طور طریقوں، اس کی بداطواری، رشوت ستانی وغیرہ کو زیادہ قریب سے دیکھ رہے تھے۔ اب مزید صرفِ نظر نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تمام صورتِ حال کا مبہم سا عکس فیض کی اشعار کے تشویشناک لہجے اور المیاتی رنگ میں جھلکتا ہے۔ آج اس کی وجہ سب پہ واضح ہے کہ سویت یونین کے ٹوٹ جانے کے ساتھ ہی ایفروایشیائی مصنفین کی تحریک اور اس انجمن کا ترجمان رسالہ ''لوٹس'' سب اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک فیض بیروت میں اُس وقت تک رہے کہ جب تک بیروت نہیں اجڑا حتیٰ کہ وہ بلڈنگ جس میں فیض صاب رہتے تھے، بمباری سے تباہ نہیں ہوگئی۔ ۱۹۸۲ء کے زمانے میں، جب ہم مہینے میں ایک بار ضرور فیض صاحب سے ملنے جدّہ سے بیروت جایا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بیگم فیض بیروت سے اپنے بچّوں کے پاس پاکستان جا چکی تھیں لیکن ہم دیکھتے تھے کہ جیسے تمام

سکون اور اطمینان فیضؔ صاحب کے جسم و ذہن میں سمٹ آیا ہے۔ وہ اپنے اندر کی ہیجان خیزی اور تلاطم کو کبھی اپنے چہرے پر نہیں لاتے تھے۔ تب ہم پریشان ہو کر اُن سے کہتے۔

فیضؔ صاحب! اب آپ کو بھی بیروت سے نکل جانا چاہیئے۔ اُدھر کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے آپ کا تقرر بھی ہو چکا ہے۔ آپ وہیں کیوں نہیں چلے جاتے۔

کہنے لگے:

نہیں بھئی۔ ہم نے جیوتی باسو صاحب اور وائس چانسلر صاحب سے معذرت کر لی ہے۔ بس اب تو چند مہینوں میں یہاں کی ذمّے داریوں کو نمٹا کر اپنی بیگم کی طرح ہم نے بھی اپنے گھر جانا طے کر لیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال، میزوؔ (منیرہ ہاشمی) چھیمی (سلیمہ ہاشمی) اور ان کے بچّوں کے درمیان گذارنا چاہتے ہیں۔

فیضؔ صاحب جب تک سیاسی قیدی رہے، زنداں کی دیواروں کے پیچھے وطن کی محبت کے گیت گاتے رہے۔ چمن میں رہے تو چمن کی خیر مانگتے رہے۔ جب جلاوطن ہوئے تو وطن واپس لوٹنے کی تمنّا کو صلیب کی طرح اپنے کاندھے پر اٹھائے اپنے ''مسافر دل'' کی ہمراہی میں ملکوں ملکوں سفر کرتے رہے۔ اور آخر کار۔ مادرِ وطن کی کشش۔ انہیں پاکستان واپس لائی لیکن شاید یہ مٹّی کا بلاوا تھا جس نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ ان کے ہم وطن ان کی تربت پر آنسو بہانے بیروت کیسے جاسکتے تھے۔

☆☆☆

# تسلیم الٰہی زلفی

## ﴿سوانحی، شخصی، تخلیقی اور اعزازی امتیازات﴾

() قلمی / سرکاری نام: تسلیم الٰہی زلفی

() خاندانی نام: تسلیم الٰہی قریشی

() والد کا نام: نسیم الٰہی قریشی

() تاریخ پیدائش: 13 جولائی 1947ء بروز اتوار صبح ساڑھے چار بجے
مطابق 26 شعبان 1366ھ

() مقام پیدائش: شکوہ آباد، آگرہ (انڈیا)

() قومیت: پاکستانی/ کینیڈین

() مادری زبان: اردو۔ اس کے علاوہ عربی، انگریزی اور فارسی کی درسگاہوں سے
مکمل تعلیم حاصل کی

() ابتدائی اور اعلاء تعلیم: مدرسۃ الفلاح جدۃ سعودی عربیہ
ماسٹرز انجینئرنگ، کراچی یونیورسٹی۔ پاکستان
ماسٹرز انگریزی ادب، امریکن یونیورسٹی، بیروت۔ لبنان

() ڈپلوما: Aircraft GSE Maintenance, Texax, USA

() پیشہ/ ملازمت: Technical Co-ordinator GSE Maintenance
Saudi Arabian Airlines, Jeddah Airport
Saudi Arabia ( 1969 - 1989 )

() اولاد: نعمان/نادیہ/ھدیٰ/فریال (چاروں شادی شدہ مقیم کینیڈا)

() عالمی سیاحت: وہ ممالک جہاں 1969ء سے تاحال مستقل آمدورفت ہے:

انگلینڈ/امریکا/کینیڈا/جرمنی/فرانس/سوئزرلینڈ/نیدرلینڈ/ڈنمارک/سوئیڈن/ناروے/اٹلی/ترکی/مصر/لبنان/سوڈان/خلیجی ریاستیں/سعودی عربیہ/جاپان/ہونگ کونگ/سنگاپور/تھائی لینڈ/انڈیا اور پاکستان وغیرہ

() دلچسپی کا شعبہ: شعری اور نثری ادب۔ نقد و نظر' تجزیہ نگاری

() صحافتی ادارت: ''ویکلی کراچی'' پاکستان (1960-1968)

() مستقل کالم نگاری: کینیڈین اخبارات میں' مقامی اور بین الاقوامی موضوعات پر 1990ء سے تاحال

☆ زمانۂ طالب علمی میں: ریڈیو پاکستان کراچی/ پاکستان ٹیلی وژن کراچی پر تعلیمی پروگراموں کی میزبانی 1962-1968ء

☆ ٹی وی میڈیا۔ ٹورونٹو۔ کینیڈا 2000ء سے تاحال:

President
Urdu TV Canada
Producer Show Host & News Caster
(7/24 Hours Canadian/Asian TV - Media

() علمی' ادبی اور سماجی وابستگی:

☆ بانی سربراہ۔ کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا 2000ء سے تاحال

☆ ایگزیکٹیو ڈائریکٹر۔ انجمن اردو کینیڈا Urdu Society of Canada

بانی: حفظ الکبیر قریشی (مرحوم)۔ سرپرست: فیض احمد فیض (مرحوم) 1972ء تاحال

☆ سربراہ: Urdu TV Canada کُل وقتی ساؤتھ ایشین اردو چینل راجرس کیبل۔ 851

☆ چیف آرگنائزر: ریڈیو پاکستان کراچی۔ بزمِ طلباء فورم کینیڈا۔ سرپرست: یاور مہدی

() تصنیفات :

☆ شہرِ افکار (شاعری) 1967ء

☆ دستاویز (شاعری) 1983ء

☆ دنیائے تصوف (عالمِ اسلام کے عظیم المرتبت روحانی پیشواء حالاتِ زندگی اور تعلیمات) مطبوعہ 1989ء

☆ تنہا پرندے کی اڑان (شاعری) 1990ء

☆ سخنور بہت اچھے (اہلِ قلم پر تنقیدی مضامین، خاکے اور منظومات) 1992ء

☆ آگرہ سے نیاگرہ (سیاحی نظمیں، عالمی سفرنامہ) 1994ء

☆ سات سمندر پار / Beyond Seven Seas اردو / انگریزی نظمیں مطبوعہ 1994ء

☆ ابابیلیں نہیں آئیں (عالمی اہم واقعاتی نظمیں) 1995ء

☆ سلسلہ تکلم کا (کینیڈین اخبارات میں، مقامی اور بین الاقوامی موضوعات پر مستقل شائع ہونے والے کالم) 2005ء

☆ میری کتابیں (9 تصنیفات کا انتخابی مجموعہ) 1016 صفحات 2006ء

☆ ڈاکٹر عبداللہ جاوید (شخصیت و فن۔ تنقیدی جائزہ) 2008ء

☆ "سفیرِ اردو" تسلیم الہٰی زلفی۔ شخصیت و فن (75 ممتاز اہلِ نقد و نظر کے تنقیدی جائزے) زیرِ اہتمام۔ اردو رائٹرز سوسائٹی انگلینڈ 2009ء

☆ اردو ناول کی دریافت (ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ) 2010ء

☆ فیض احمد فیض بیروت میں (جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ) اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد مطبوعہ 2011ء

☆ مغربی دنیا کے اردو اہلِ قلم (یورپ، امریکا اور کینیڈا میں آباد 150 اہلِ قلم کا تنقیدی

اور تجزیاتی جائزہ) 800 صفحات۔ دوسری اشاعت 2014ء

☆ یہ عشق بھی عجیب ہے (ساتواں شعری مجموعہ) اردو عربی فارسی اور انگریزی کلام کا انتخاب۔450 صفحات۔ دوسری اشاعت 2014ء

☆ عندلیب گلستانِ شاعری (صبا اکبر آبادی۔ تحقیق و نقد و نظر) بختیار اکیڈمی۔2012ء

() اعزاز /اسناد/نقد انعامات / میڈل / شیلڈ

☆ شاہ فیصل سعودی عرب کی جانب سے سند اور نقد انعام۔ نیشنل کالج کراچی کے طالبعلم تسلیم الٰہی زلفی نے بادشاہ سلامت کا پورٹریٹ بنا کر کراچی ائرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کی صف میں صدرِ پاکستان ایوب خان کی موجودگی میں شاہ کو پیش کیا۔ 1965ء

☆ بہترین شاعر۔ بین الجامعات پاکستان ایوارڈ۔ کراچی یونیورسٹی کی جانب سے جولائی 1968ء

☆ بہترین کمپیئر بزمِ طلباء۔ یونیورسٹی میگزین پروگرام ایوارڈ۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی جانب سے 1968ء

☆ صدرِ پاکستان کی معیت میں خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کے اندر حاضری 1978ء

☆ رکن NASA کیلیفورنیا USA پلانیٹری ریسرچ کا سرکاری ادارہ 1978ء تا حال

☆ بین الاقوامی ممتاز شاعر ایوارڈ۔ عالمی اردو کانفرنس۔ نئی دہلی۔ انڈیا 1984ء

☆ حسنِ کارکردگی پیور گولڈ میڈل۔ بیس سالہ پیشہ ورانہ فنی خدمات پر سعودی عریبین ائرلائنز جدہ ائرپورٹ 1989ء

☆ اعلیٰ ادبی تخلیقی صلاحیت کی اعترافی سند اور میڈل۔ حکومت اونٹاریو بمقام پارلیمنٹ ہاؤس۔ آٹواء۔ کینیڈا 1994ء

☆ بہترین شاعر۔ ایسٹر نیوز کینیڈا کی جانب سے 1999ء

☆ بہترین نغمہ نگار۔ ٹورونٹو فلم پروڈیوسرز کی جانب سے 2000ء

☆ کلیدی خطاب ''کینیڈا۔ اردو کی نئی بستی'' اردو فیسٹول 2004ء لندن۔ انگلینڈ

☆ رائٹرز فورم کینیڈا۔ کی پچیس سالہ خدمات پر اعترافی شیلڈ 2008ء
☆ ایکسی لینس ایوارڈ۔ پریمئر اونٹاریو۔ کینیڈا ڈیلٹن مکینٹی کی جانب سے 2009ء
☆ جوئیل آف دی ساؤتھ ایشین کمیونٹی ایوارڈ۔ محفل گروپ کی جانب سے 2010ء
☆ ستارۂ امتیاز۔ حکومتِ پاکستان کا سول اعزاز۔ اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد کی نامزدگی 2011ء
☆ سفیرِ ادب ایوارڈ۔ سخنور کینیڈا کی جانب سے 2011ء
☆ ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ۔ گولڈ میڈل اور شال۔ ساحر کلچرل اکیڈمی۔ لدھیانہ۔ انڈیا کی جانب سے 2011ء
☆ وقارِ اردو ایوارڈ۔ تہذیبِ اردو دہلی۔ انڈیا کی جانب سے 2011ء
☆ افتخارِ اردو ایوارڈ۔ یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی لندن۔ یو کے کی جانب سے 2011ء
☆ لٹریری اسکالر ایوارڈ۔ شریف اکیڈمی جرمنی کی جانب سے 2011ء
☆ فیض احمد فیض ایوارڈ۔ بزمِ ادب کوپن ہیگن۔ ڈنمارک کی جانب سے 2011ء
☆ آفتابِ اردو ایوارڈ۔ پاکستان آرٹس کونسل کویت کی جانب سے 2011ء
☆ سخن شناس ایوارڈ۔ ورلڈ پیس اینڈ لٹریری فورم لاہور پاکستان کی جانب سے 2011ء
☆ وثیقہ اعترافِ کمال۔ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی جانب سے 2011ء
☆ ایکسی لینس ایوارڈ۔ انڈو پاک فرینڈشپ ایسوسی ایشن۔ کینیڈا کی جانب سے 2011ء
☆ ایکسی لینس ایوارڈ۔ RCCA -Tv مانٹریال۔ کینیڈا کی جانب سے مغربی دنیا میں اردو ادب کی ترویج کے لیے 2011ء
☆ تمغہ فروغِ اردو۔ دنیائے مغرب۔ غالب میموریل ٹرسٹ لاہور۔ پاکستان 2011ء
☆ روزن ادبی ایوارڈ۔ ورلڈ پنجابی فورم۔ روزن ادبی فورم۔ گجرات پاکستان 2011ء
☆ بیسٹ لٹریری اسکالر ایوارڈ۔ پریڈ آف نیشن کارنوال۔ کینیڈا کی جانب سے 2012ء

☆ افتخارِاردوادب شیلڈ۔اردوتحریک عالمی۔یوکے' کی جانب سے2012ء

☆ اعتراف کمالِ فن اردوادب۔شیلڈ بزمِ شعروادب' برطانیہ کی جانب سے2012ء

☆ محافظِ اردوادب شیلڈ۔یورپین اردورائٹرز سوسائٹی۔یوکے کی جانب سے2012ء

☆ شیلڈآف آنر۔شریف اکیڈمی جرمنی کی جانب سے2012ء

☆ اعتراف کمالِ فن۔اعزازی شیلڈ۔استنبول یونیورسٹی۔ترکی' فارن لینگویج فیکلٹی کی جانب سے انعقادِ شامِ زلفی کے ساتھ2012ء

☆ پاسبانِ اردوایوارڈ۔سفارتخانہ پاکستان برلن۔بین الاقوامی اردومرکز جرمنی کی جانب سے پچاس سالہ تخلیقی کارکردگی کے اعتراف میں2012ء

☆ ایشین ہیری ٹیج کینیڈاایوارڈ۔پرووینشل کلچرل اینڈ ہیری ٹیج منسٹری اونٹاریو۔کینیڈا کی جانب سے مئی2013ء

☆ اعتراف کمالِ فن ایوارڈ۔پچاس سالہ علمی' ادبی' تخلیقی' اشاعتی' نشریاتی' اجرائی اور انتظامی خدمات اور کارکردگی کے اعتراف میں۔جہانِ اردو برمنگھم انگلینڈ۔اکتوبر2013ء

☆ عالمی سفیرِ امن ایوارڈ۔ڈنمارک کلچرل منسٹری کی جانب سے۔کوپن ہیگن میں منعقدہ اعزازی تقریب اکتوبر2013ء میں پیش کیا گیا۔

☆ وثیقہ اعتراف کمالِ فن۔انجمن ترقی اردو پاکستان۔تقریب پزیرائی منعقدہ کراچی مارچ2014ء

☆☆☆

# متعلقاتِ
# تسلیم الٰہی زلفی

کینیڈا میں آباد فنونِ لطیفہ کے ادبی اسکالر

# تسلیم الٰہی زلفی

علمی، ادبی، تاریخی، عالمی، سماجی، ثقافتی، معاشرتی اور فنونِ لطیفہ کے حوالوں سے سیر حاصل گفتگو

انٹرویو: شعیب صادق (کینیڈا)

---

☆ 1962-1968 زمانہ طالب علمی میں ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن پر تعلیمی پروگراموں کی میزبانی کی۔

☆ 1965 میں شاہ فیصل کی پاکستان آمد پر ایوب خان کے ساتھ استقبال کرنے والوں کی صف میں شاہ کو پورٹریٹ پیش کیا۔

☆ 1970 ملکۂ برطانیہ نے بکھنگم پیلس میں چائے پر مدعو کیا۔

☆ 1978 صدرِ پاکستان کی معیت میں خانہ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کے اندر حاضری۔

☆ 1978 اسلام آباد میں منعقد ہونے والی اہلِ قلم کانفرنس میں شرقِ اوسط کی نمائندگی کی۔

☆ 1982 عالمی اردو کانفرنس دہلی انڈیا میں ممتاز بین الاقوامی شاعر کا ایوارڈ حاصل کیا۔

☆ 2000 اردو فیسٹول لندن میں ''اردو کی نئی بستیاں'' کے عنوان سے کلیدی مقالہ پیش کیا۔

☆ فروری 2011 اکادمی ادبیات حکومتِ پاکستان اسلام آباد نے اٹھارویں کتاب ''فیض احمد فیض بیروت میں'' شائع کی اور ستارۂ امتیاز کے لیے نامزد کیا۔

☆ جولائی 2011 میں دنیا بھر کے 9 ممالک سے اہم ادبی اداروں کے سربراہوں نے ٹورانٹو آ کر ایوارڈ پیش کیے۔

☆ ستمبر 2012 گوئٹے انسٹیٹیوٹ اور میوزیم فرینکفرٹ کا دورہ کیا اور وہاں موجود ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے طلباء کو ''گوئٹے کے افکار'' پر توسیعی لیکچر دیا۔

☆ نومبر 2012 میں اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی خصوصی دعوت پر اسلام آباد تشریف لے گئے۔

---

عرصۂ دراز سے میری خواہش تھی کہ میں کبھی کینیڈا میں آباد فنونِ لطیفہ کے نامور ادبی اسکالر تسلیم الٰہی زلفی صاحب سے وقت لے کر' ان کے خاندان' ان کی زندگی' اکتسابِ علم و ہنر' فکری و تخلیقی صلاحیتوں' علمی' ادبی' ثقافتی' اجتماعی اور نشر و اشاعتی سرگرمیوں سے براہِ راست آگاہی حاصل کروں۔ اور آخر گزشتہ دنوں مجھے یہ موقع مل ہی گیا کہ میں نے زلفی صاحب سے وقت لے کر ان کی اقامت گاہ' ٹورانٹو کے ایک دامنِ کوہ میں چھوٹے سے جنت نظیر ٹاؤن ''رچمنڈ ہل'' کے وسیع و آراستہ بنگلے میں' ان سے ملاقات کی۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے پوچھا' زلفی صاحب! ہمیں اپنے خاندانی پس منظر اور ابتدائی حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے' تو تسلیم الٰہی زلفی گویا ہوئے: ''میرا خاندانی نام تسلیم الٰہی قریشی ہے' صدیوں پہلے ہمارے پُرکھے تبوک جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کی تبلیغ کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ سیّد احمد شہیدؒ میرے جدِّ امجد ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی' تو اُس موقع پر ہمارے خاندان کے کچھ لوگ سعودی عرب واپس چلے گئے' کچھ لوگ پاکستان ہجرت کر گئے اور باقی کے ہندوستان ہی میں آباد رہے۔ میں ۱۳ / جولائی ۱۹۴۷ء بروز اتوار صبح ساڑھے چار بجے آگرہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد قبلہ نسیم الٰہی قریشی نے' میری والدہ محترمہ سعیدہ خاتون اور مجھے لے کر پاکستان کی جانب ہجرت کی۔ لیکن پاکستان میں محض تین سال کے قیام کے بعد ۱۹۵۰ء کے اواخر میں اپنی فیملی کے ساتھ سعودی عرب چلے گئے۔ جہاں اگلے سال مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جدّہ کے ایک عربی پرائمری اسکول مدرسۃ الفلاح میں داخل کر دیا گیا''۔ میں نے

زلفی صاحب کی قطع کلامی کرتے ہوئے حیرت اور تجسس کے ساتھ پوچھا۔لیکن سر!۔ پھر یہ آپ کا اردو زبان پر عبور؛اردو شعر و ادب‘ نقد و نظر‘تخلیق‘ تصنیف و اشاعت کس طرح ممکن ہوا؟۔میرے اس سوال پر زلفی صاحب نہایت آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے:”میری مادری زبان اردو ہے۔لہٰذا بچپن میں گھر پر مجھے باقاعدہ اردو پڑھنا‘ لکھنا سکھایا گیا۔جس کے لیے پاکستان سے اردو درسی کتابیں منگوائی گئیں۔ بلکہ یہاں تک ہوا کہ جس وقت میں نے عربی اسکول سے پرائمری پاس کی۔تو اُس دوران میں نے گھر پر پاکستان ایجوکیشنل بورڈ سے منظور شدہ آٹھویں جماعت کا نصابی کورس بھی مکمل کیا“۔تو پھر آپ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے پاکستان کب تشریف لے گئے؟۔ میں نے زلفی صاحب سے بات جاری رکھنے کی درخواست کی۔اس بار تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے باقاعدہ ہنستے ہوئے فرمایا:”ارے بھئی دیکھا جائے تو‘حصولِ تعلیم کے لیے جب ہم نے ۲۶ را کتوبر ۱۹۵۸ء کو کراچی میں قدم رکھا ہے تو پاکستان میں انقلاب آ گیا۔یعنی دوسرے روز ۲۷ را کتوبر ۱۹۵۸ء کو افواجِ پاکستان کے فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان نے عنانِ حکومت سنبھال لی۔یاد رہے اُس وقت پاکستان کا دارالحکومت کراچی ہوا کرتا تھا۔خیر کراچی پہنچ کر ہم نے اپنی پڑھائی شروع کر دی۔“

تو پھر آپ کی ادبی سرگرمیوں میرا مطلب ہے۔شاعری‘ نثر نگاری کا آغاز کب ہوا؟۔ہم نے ثانوی تعلیمی میدان میں قدم رکھنے والے تسلیم الٰہی قریشی سے اُن کی ادبی دنیا میں داخلے کی بابت دریافت کیا۔تو انہوں نے بتایا:”عربی کی مشہور کہاوت کہ۔ الشاعرَ یولدُ‘ ولا یصنع A Poet is born not

made کے مصداق میں موزوں طبع کے ساتھ پیدا ہوا۔ لہٰذا اپنے بچپن ہی سے میں نے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کر دیں تھیں۔ اور ۱۹۵۸ء میں جب کراچی پہنچا تو' میرے شعری اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے' میرے پھوپا محمود الزماں خان نیازی صاحب نے مجھے اپنے پیر بھائی حضرت بہزاد لکھنوی صاحب کی شاگردی میں دیدیا۔ جنہوں نے سب سے پہلے تو مجھے ''زلفی'' کا تخلص دیا۔ اور اس کے بعد با قاعدہ علمِ عروض کی تعلیم۔ جبکہ اُن ہی دنوں نثر نگاری کے لیے میں نے روزنامہ جنگ کراچی میں بچوں کے صفحات ''ہونہار لیگ'' کے انچارج شفیع عقیل صاحب سے ملاقات کی اور ان کے مشورے سے عربی کہانیوں کے اردو ترجمے اخبار جنگ کے لیے لکھنا شروع کیے' جو بچوں اور بڑوں میں بیحد پسند کیے گئے۔ اور تب ہی سے ''ہمدرد نونہال'' اور ''تعلیم و تربیت'' میں ہماری نظمیں بھی شائع ہونا شروع ہوئیں۔ جبکہ ہماری پہلی غزل جس بڑے اور دقیق ادبی رسالے کے جولائی ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی وہ ''الشجاع'' ہے۔ اور پھر جب ۱۹۶۶ء ہی میں جب ہمارا پہلا شعری مجموعہ ''مشعرِ افکار'' منصۂ شہود پر آیا' تو گویا ہمیں پر لگ گئے۔ اور پاکستان و ہندوستان کے تمام ادبی مجلّات میں ہماری تخلیقات تواتر سے شائع ہونا شروع ہو گئیں' جن میں: الشجاع' نئی قدریں' ادبِ لطیف' نیرنگِ خیال' افکار' سیپ' فنون' 'اوراق' شاعر' شب خون' ماہِ نَو' نیا دور' جامِ نَو' اقدار' بیسویں صدی' طلوعِ افکار' صریر' ادبیات' اردو پنچ' محفل' منشور' تخلیق' الفاظ' بازگشت' رابطہ' انشاء' ارتقاء' سبق اردو' مباحثہ' دستک' اسباق' عصری آگہی' نئی کتاب' روشنائی' نایاب وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۷ء ہی میں ہم نے اپنی ادارت میں ''ویکلی کراچی'' جریدہ نکالنا

شروع کیا۔ جس کی سرپرستی ابراہیم جلیس صاحب نے فرمائی"۔ زلفی صاحب نے جب اپنی تخلیقی اوراشاعتی سرگرمیوں کا ذکرختم فرمایا۔توہم نے ان کی نشریاتی سرگرمیوں کے حوالے سے بھی ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی پران کی کارکردگی کے بارے میں انہی کی زبانی کچھ سننا چاہا۔لہٰذاوہ گویاہوئے:

"اپنے کالج کے زمانے میں ہم نے ریڈیو پاکستان کراچی سے تعلیمی پروگراموں کی میزبانی شروع کی۔ ۱۹۶۲ء میں جب ہمارے پروڈیوسر عالمی شہرت یافتہ مصوّر اور رسّام صادقین صاحب کو پیرس کے "لوور عجائب گھر" (جہاں مونالزاء کی تصویر آویزاں ہے) کی تزئین و آرائش کے لیے فرانس بلایا گیا تو اُن کی جگہ یاور مہدی صاحب کو یہ ذمّہ داری سونپ دی گئی۔ اس طرح ریڈیو پاکستان کراچی سے ان کی نگرانی میں "بزمِ طلباء" اور "یونیورسٹی میگزین" کی میزبانی ہم نے انجام دی۔ اور جب ۱۹۶۶ء میں کراچی سے PTv کی نشریات کا آغاز ہوا تو' چونکہ اُس وقت کسی کے پاس ٹی وی کے کام کا تجربہ نہیں تھا۔لہٰذا ریڈیو سے ہم ریڈیو کے آرٹسٹوں کو اپنے اپنے شعبے کے پروگرام کرنے کے لیے ٹی وی بلالیا گیا۔ اس طرح مجھے اور عبیداللہ علیم کو تعلیمی اور ادبی پروگرام ہوسٹ کرنے کے لیے طارق عزیز صاحب (جو اُن دنوں ٹی وی پر خبریں بھی پڑھتے تھے) کے سپرد کردیا گیا۔ یاد رہے کہ کراچی سے PTv کی نشریات کا یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ ٹی وی اسٹیشن کی عمارت ابھی پورے طور پر مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور ہم لوگ شامیانوں اور قناتوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے پروگرام کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں شام کے وقت محض چند گھنٹوں کی "لائیو" نشریات ہوتی تھیں۔ یعنی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی"۔ کراچی میں زلفی صاحب کے تعلیمی

'اکتسابی' تربیتی دور کی سرگرمیوں نمایاں کارکردگی سے آگاہی کے بعد میرے ذہن میں آیا کہ میں ان سے اُس دور میں حاصل کیے ہوئے انعامات' اعزازات' اسناد اور ایوارڈز کے بارے میں تو معلوم کروں۔ اور یہ بھی کہ ان کے تعلیمی دور میں وہ کونسا ایسا موقع تھا' جس نے انہیں ملک گیر شہرت دی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے فنونِ لطیفہ کے سب ہی شعبوں کی بنیادی فہم و ادراک سے نوازا ہے' جس کے زیرِ اثر میں نے ان تمام علوم کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے۔ یہ الگ بات کہ شعر و سخن اور نقد و نظر کو اپنا تشخص بنالیا۔ لہٰذا مصوری اور خطاطی بھی میرا شوق ہے۔ اور میرے اسی ہنر نے مجھے ۱۹۶۵ء میں اُس وقت ملک گیر شہرت سے ہمکنار کیا' جب میں نیشنل کالج کراچی کا طالب علم تھا اور میں نے شاہ فیصل کا پورٹریٹ بنا کر ایک خوبصورت فریم میں' کراچی ائر پورٹ پر ان کی پاکستان آمد کے موقع پر' استقبال کرنے والوں کی صف میں' صدرِ پاکستان جنرل محمد ایوب خان کی موجودگی میں' بادشاہ سلامت کو پیش کی۔ جہاں تک دیگر انعامات اور ایوارڈز کا تعلق ہے تو' پاکستان کے انٹر کالج اور انٹر یونیورسٹی ڈیبیٹس اور مشاعروں میں ہمیشہ میں نے اپنی درسگاہ کے لے ٹرافی اور پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کراچی سے ''بہترین کمپئر بزمِ طلباء ۱۹۶۸ء ایوارڈ'' بھی حاصل کیا''۔

یہ ۱۹۷۰ء کے اوائل کی بات ہے کہ برطانیہ کی شہزادی ''این'' کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ لہٰذا اُس موقعے پر تاجِ برطانیہ کے ایماء پر BBC کی جانب سے دنیا بھر کے شعراء کو دعوت دی گئی کہ وہ اُس موقعے مناسبت سے شعر کہیں۔ معیار اور خوبصورتی کے اعتبار سے پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والی شاعری کے خالق

کو بحیثیت شاہی مہمان برطانیہ بلایا جائے گا۔ لہٰذا پاکستان سے ابنِ انشاء نے اور سعودی عرب سے اِس خاکسار نے' پہلا اور دوسرا ہمبر حاصل کیا۔ اور ہم دونوں کو شاہی دعوت نامے بھیج دیئے گئے۔ اُدھر انشاء جی اپنی جہاں گردی کے سبب پہلے بھی کئی بار لندن جا چکے تھے اور اِدھر ہمارا بھی ائرلائنز کی ملازمت اور منصبی ذمہ داریوں کی بجا آواری کے سبب لندن تو گویا گھر آنگن تھا۔ لیکن شاہی مہمان کی حیثیت سے انگلینڈ جانے کی بات ہی اور تھی۔ لہٰذا ہم دونوں ہی اس مرتبہ خصوصی اہتمام کے ساتھ لندن گئے تھے۔ اور اُسی موقعے پر BBC میں اطہر علی کے دفتر میں' یاور مہدی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انشاء جی چھپائے۔ ۱۹۴۷ء تک تاجِ برطانیہ ''بن بلائے مہمان'' کی حیثیت سے برِصغیر پر مسلّط رہا۔ لیکن آج۔ ابنِ انشاء' یاور مہدی اور تسلیم الٰہی زلفی۔ پاکستان کے عام شہری ''شاہی مہمان'' کی حیثیت سے برطانیہ میں موجود ہیں۔ اُس موقعے پر ہم تمام مہمانوں کو قصرِ شاہی شاہی (بکھنگم پیلس) کی اندرونی سیر بھی کروائی گئی۔ شاہی میوزیم دکھایا گیا اور ملکہ معظّمہ کے ساتھ ہم لوگوں نے چائے بھی پی۔ قصرِ شاہی کی سیر اور ملکہ سے ملاقات کے دوران ہم لوگوں نے انشاء جی کے لبوں پر خفیف تھرتھراہٹ کے ساتھ۔ مسلسل ایک فاتحانہ مسکراہٹ دیکھی۔ اس ضمن میں جب بی بی سی پر اطہر علی نے ہم لوگوں کا انٹرویو کیا' تب بھی انشاء جی کی جولانئ طبع اپنے عروج پر تھی۔

کراچی سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد تسلیم الٰہی زلفی اپنے والدین کے پاس جدّہ واپس چلے گئے تھے۔ لہٰذا اب ہم نے زلفی صاحب سے سعودی عرب میں ان کی عملی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا:

''جدّہ اپنے والدین کے پاس واپس پہنچ کر ہم نے سعودی عربین ائرلائنز جوائن کرلی۔ جہاں سے ہمیں Aircraft GSE Maintenance کی تربیت' ڈپلومہ اور لائسنس کے حصول کے لیے ڈیلس فورتھ ورتھ امریکہ بھیجا گیا۔ جس کی تکمیل کے بعد ہم جدّہ ائرپورٹ پر اپنے منصبی فرائض کی بجاآوری میں مشغول ہوگئے۔ اور بیس سال تک پوری محنت' لگن اور ذمّہ داری کے ساتھ کام کیا۔ اسی دوران چونکہ ہماری شادی بھی ہوگئی تھی۔ لہٰذا اپنے پروفیشن اور فیملی سے متعلق فرائض کی بجا آوری کے بعد ہمیں جتنا بھی وقت ملتا ہم اپنے ذوق وشوق کی تکمیل پر صرف کرتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُس بیس سال کے عرصے میں ہمارے صرف دو شعری مجموعے ''دستاویز'' اور ''تنہا پرندے کی اڑان'' شائع ہوئے۔ البتہ سعودی عربیہ میں اجتماعی تقریبات پر پابندی کے باوجود ہم نے پابندی سے اپنے گھر پر ماہانہ ادبی نشستوں اور مشاعروں کا اہتمام کیا۔ اور ان ادبی اجتماعات میں پاکستان' ہندوستان اور مغربی ممالک سے عمرہ یا حج پر آنے والے نامور اور ممتاز شعراء واد باء نے شرکت فرمائی ہے۔ جن کا قیام بالعموم میرے غریب خانے پر ہی ہوتا تھا۔ جن کے قیام کے لیے ہم نے چند کمرے مختص کیے ہوئے تھے۔ ان اکابرِ علم وادب میں: احمد ندیم قاسمی' عبادت بریلوی' جمیل جالبی' جمیل الدین عالی' ابنِ فرید' تابش دہلوی' شاعر لکھنوی' اقبال صفی پوری' کلیم عاجز' دلاور فگار' سرشار صدیقی' محشر بدایونی' منظر ایوبی' طفیل ہوشیار پوری' سلطان رشک' اقبال احمد صدیقی' اطہر ضیائی' کلیم عثمانی' سید ضمیر جعفری' احمد فراز' محسن بھوپالی' کوثر نیازی' جسٹس تنزیل الرحمٰن' جاذب قریشی' احمد سجاد راغب مرادآبادی' صہبا لکھنوی' الطاف حسن قریشی' مولانا صلاح الدین

(جسارت) حکیم محمد سعید' امجد اسلام امجد' عطاء الحق قاسمی' صلاح الدین پرویز' بیکل اتساہی' انور معظم' تابش مہدی' کے علاوہ اور بہت سارے اہلِ ادب جن کے نام اب میرے ذہن سے نکل گئے ہیں۔ اس کے علاوہ' وہاں کی پابندیوں کے پیشِ نظر' ۱۹۷۸ء میں ہم نے پہلا کُل پاک و ہند مشاعرہ' پاکستانی سفارت خانہ جدّہ کے احاطے میں منعقد کیا۔ جس میں پاکستان سے: حفیظ جالندھری' احسان دانش' مولانا ماہر القادری' سرور بارہ بنکوی' وحیدہ نسیم۔ اُدھر ہندوستان سے: خمار بارہ بنکوی' کلیم عاجز' شمیم جے پوری اور ملک زادہ منظور وغیرہ نے شرکت فرمائی''۔ جب تسلیم الٰہی زلفی نے جدّہ کے ۱۹۷۸ء میں منعقد کیے جانے والے مشاعرہ کا ذکر کیا۔ تو ہمیں یاد آیا کہ یہی تو وہ وقت تھا جب زلفی صاحب جدّہ سے 'امریکن یونیورسٹی بیروت (لبنان) انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کے لیے بیروت تشریف لے گئے تھے اور جہاں فیض احمد فیض کے قرب میں انہوں نے چار سال گزارے۔ لہٰذا اس ضمن میں ہمارے استفسار پر زلفی صاحب نے فرمایا:

''انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنا ہماری دیرینہ خواہش تھی۔ مگر ملازمت اور ازدواجی ذمّہ داریوں کی گہما گہمی کے سبب ہماری اس خواہش کی تکمیل ہمیشہ التواء کا شکار رہی۔ لیکن ۱۹۷۸ء میں جب ہمیں یہ خبر ملی کہ فیض صاحب بیروت Move ہوگئے ہیں تو ہم نے بھی اپنا ٹرانسفر سعودی ائرلائنز کے بیروت اسٹیشن پر کروالیا۔ اور ہنگامی طور پر امریکن یونیورسٹی بیروت میں اپنا رجسٹریشن کرواکر بیروت چلے گئے۔ بیروت کی تعلیمی اور ملازمتی گہما گہمی اور مصروفیات کا ابتدائی عرصہ گزارنے کے بعد جب معمولاتِ روز و شب ذرا اعتدال پر آئے تو ایک غزل کی آمد ہوگئی۔ اتنے دن

کے بعد غزل کہہ کر دل کو ایک لطیف کیف و سُرور مِلا۔ اُسی کیفیت میں ہمیں فیضؔ صاحب کا خیال آیا۔ تصور ہی تصور میں ہم نے فیضؔ صاحب کو دیکھا۔ بیروت شہر۔ ایفرو ایشیائی ادبی انجمن کے سہ ماہی مجلّے ''لوٹس'' کا دفتر' چیف ایڈیٹر کی کرسی' جلتا سگریٹ' چلتا قلم اور سوچتی آنکھیں۔ اُس وقت دن کے دس بجے تھے اور ہم ٹیکسی سے ''لوٹس'' کے دفتر جا اترے۔ فیضؔ صاحب کے تصور سے جو منظر ہمارے ذہن کے پردے پر ابھرا تھا۔ وہاں ان کے کمرے میں۔ انہیں اسی کی جیتی جاگتی تصویر کے روپ میں دیکھا!۔ کراچی میں اپنے تعلیمی دور میں کئی بار فیضؔ صاحب کے عبداللہ ہارون کالج میں تقریری مقابلوں اور مشاعروں کے موقع پر ان سے ملاقات رہی اور کلام سنانے کا موقع ملا۔ لیکن اب کی ملاقات ایک نئے اور مختلف ماحول اور وقت میں ہوئی۔ بہر حال' فیضؔ صاحب نے ہمیں یوں اچانک دیکھ کر حیرت اور مسرت کا اظہار فرمایا' بڑی شفقت سے بٹھایا۔ ہمارے انہیں Sir کہہ کر مخاطب کرنے پر کہنے لگے۔ ''بھئی یہ کراچی کا' کالج یا یونیورسٹی تو نہیں''۔ ہم نے عرض کیا کہ لیکن ہمارا تعلیمی دور ہنوز جاری ہے۔ اور پھر ہم نے انہیں بیروت میں اپنی موجودگی کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ''بھئی اب یہاں ہو' تو ملتے رہنا''۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کراچی کے بھی اہلِ ادب کی فرداً فرداً خیریت دریافت کرتے رہے۔ پھر یکایک بولے ''بھئی شاعری کیسی جارہی ہے؟''۔ عرض کیا۔ بڑے دنوں بعد آج ہی کچھ شعر ہوئے ہیں۔ اور یہی شعر ہمیں اِس وقت آپ کے پاس لے آئے ہیں۔ اس پر وہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں مسکرائے۔ اور فرمایا ''تو ارشاد!''۔ جس پر ہم ایکدم ٹپٹا سے گئے۔ اور عرض کی کہ ہم پہلے ہی آپ کا

بہت وقت لے چکے ہیں۔ اگلی بار۔ ہماری بات کو کاٹتے ہوئے فیضؔ صاحب نے فرمایا۔ ''بھئی ہم آپ کے شعر ضرور سنیں گے''۔ تکمیلِ حکم کے طور پر، ہم نے جیب سے پرچہ نکالا اور عرض کیا۔

پہلے سینے کے اندھیرے میں چراغاں ٹھہرے
بعد اُس کے مرے گھر میں کوئی مہماں ٹھہرے
ہے فصیل اونچی بہت، بند ہے دروازۂ شہر
اب کہاں قافلۂ خانہ بدوشاں ٹھہرے
اپنے اسباب میں، اک بے سروسامانی تھی
شہر سے دُور ہی، ہم بے سروساماں ٹھہرے
روح کے چاروں طرف جسم کے ہنگامے ہیں
ایسے پتھراؤ میں کیا آئینۂ جاں ٹھہرے
شہر میں قحط ہے اب بخیہ گروں کا زلفیؔ
اپنے ہاتھوں میں ذرا، اپنا گریباں ٹھہرے

فیضؔ صاحب نے ہمارے اشعار نہایت توجہ سے سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرما کر ہمت افزائی کی۔ بیروت میں فیضؔ صاحب سے ہماری یہ پہلی ملاقات چار گھنٹوں پر محیط تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب دو بج گئے! ہم نے اب اجازت چاہی تو کہنے لگے۔ ''آتے رہنا۔ اور ہاں۔ آپ کی ابتدائی تعلیم تو عربی ہی میں ہوئی ہے، آپ کچھ فلسطینی شعراء کی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ کریں''۔ اور پھر اپنی میز کی دراز سے نکال کر ہمیں محمود درویشؔ کا ۱۹۷۰ء میں ''دارالادب بیروت'' سے شائع ہونے والا (۹۴)

صفحات پر مشتمل چوتھا شعری مجموعہ العصافیر تموت فی الجلیل (پرندے جلیل میں مر رہے ہیں) دیا اور فرمایا۔ ''اب کی بار گھر آئیں۔ اور یہ کتاب پڑھ کر آئیں' ایک آدھ نظم کا پہلے نثری ترجمہ بھی کرلائیں۔ دیکھیں گے''۔ یہاں ہم آپ کی آگاہی کے لیے بتاتے چلیں کہ شارع الحمراء ساحلِ سمندر پر ''لوٹس'' میگزین کے دفتر سے ملی ہوئی ایک عمارت کی چھٹی منزل پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں فیضؔ صاحب اور ان کی بیگم ایلس کی رہائش تھی۔ اس کی کھڑکیوں سے باہر دیکھیں تو ہر طرف سمندر ہی سمندر نظر آتا ہے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد فیضؔ صاحب کی پسند کا یہ فلیٹ ملا تھا۔ خیر' اس کے بعد ظاہر ہے بیروت میں فیضؔ صاحب سے مسلسل ملاقاتیں رہیں۔ جن کا احوال جب ہم لکھنے بیٹھے تو ایک ایسی کتاب بن گئی۔ جس میں فیضؔ صاحب کی جلاوطنی' تنہائی اور فکری شکست وریخت کے ایک نہایت ہی اہم عرصے کی غیر ریکارڈ شدہ داستان ہے۔ بیروت میں' فیضؔ صاحب کی جلاوطنی کے اس دوسرے پڑاؤ کا چار سالہ عرصہ ہنوز منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا۔ لیکن ابھی فروری ۲۰۱۱ء میں ''فیضؔ صدی'' جشن کے موقع پر اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد نے نہایت سرگرمی اور اہتمام کے ساتھ ہماری یہ کتاب ''فیض احمد فیض بیروت میں'' شائع کی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں اکادمی کے چیئرمین فخر زمان نے لکھا کہ۔ ''تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے ''فیض احمد فیض بیروت میں'' لکھ کر فیضؔ صاحب کی زندگی کی کتاب مکمل کردی ہے''۔ ہم زلفی صاحب کی اہم کتاب ''فیض احمد فیض بیروت میں'' پڑھ چکے ہیں۔ جس میں انہوں نے قیامِ بیروت کے دوران فیضؔ صاحب کی اُن مختلف اکابر سے ملاقاتوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے' جن میں ترجمان کے طور پر وہ بھی شریک

رہے۔ ان شخصیات میں یاسر عرفات اور محمود درویش نمایاں ہیں۔ لہٰذا ہم نے زلفی صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان اکابر سے یادگار ملاقاتوں کے ضمن میں بھی اپنی یادیں تازہ فرمائیں۔ تو وہ گویا ہوئے:

۱۹۷۸ء میں امریکا' اسرائیل اور مصر کی باہمی مشاورت سے Camp David معاہدہ طے پایا جس کی زد سے غزہ کی مغربی پٹی میں فلسطین کی خود مختار حکومت قائم ہونا تھی۔ لیکن اس معاہدہ پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ اس طرح PLO کے چیئرمین یاسر عرفات کی سرگرمیوں میں بجلیاں بھر گئیں۔ اپنے اس حق کے حصول کے لیے انہوں نے ایشائی اور افریقی ممالک سے رابطہ قائم کرنا شروع کیے۔ اس ضمن میں پہلا کام تو انہوں نے یہ کیا کہ ''لوٹس میگزین'' کا صدر دفتر قاہرہ سے بیروت منتقل کیا۔ اس کے بعد فیضؔ احمد فیضؔ کو بیروت بلا کر اس رسالہ کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کی اور خود بھی اپنے تنظیمی کاموں سے وقت نکال کر رسالہ کی سرپرستی کرتے رہے۔ اُن ہی دنوں ہم نے فیضؔ صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم چیئرمین یاسر عرفات سے مِلنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ اگلی بار جب وہ ہمیں ملاقات کے لیے بلائیں گے تو ہم آپ کو بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ معمول کے مطابق ایک اتوار کو ہم فیضؔ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: بھئی آنے والے بدھ کو دو بجے یاسر عرفات صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔ یہی رسالے کے سلسلے میں کچھ امور پر بات کرنی ہے۔ اگر آپ اپنی پڑھائی کے دوران یونیورسٹی سے چند گھنٹے نکال سکتے ہیں تو ''ابو عمار'' سے ملاقات کی اپنی آرزو پوری کر لیجیے۔ ہم نے ہامی بھر لی۔ البتہ ایک دشواری تھی، جس کا ہم نے فیضؔ صاحب سے قطعئی ذکر نہ کیا۔ ورنہ وہ ہمیں روک

دیتے' اور وہ یہ کہ بدھ کو ہمارا بہت اہم ٹیسٹ تھا۔ اپنے پروفیسر سے بات کی' کہ زندگی میں پہلی بار ہمیں چیئرمین یاسر عرفات سے ملاقات کا موقع مِل رہا ہے اگر وہ ہمیں ٹیسٹ جمعرات کو لکھنے کی اجازت دیدیں تو ہماری یہ خواہش پوری ہوسکتی ہے۔ جارج وکٹر نہایت شفیق استاد تھے' انہوں نے ہمیں اجازت دیدی۔ مقررہ دن ہم فیضؔ صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ جہاں سے PLO کی گاڑی ہم دونوں کو تنظیم کے ہیڈکواٹر لے گئی۔ شارع الحمراء سے متصل ایک وسیع احاطے میں ایک پرانی سی سفید عمارت' جس کی چھت سبز کھپریل کی بنی ہوئی ہے۔ احاطے کے گیٹ پر دونوں جانب لکڑی کے کیبن دو بندوق بردار مستعد سیکیورٹی گارڈ۔ ہماری گاڑی جب گیٹ پر پہنچی تو کیبن سے ایک پہرے دار برآمد ہوا' جس نے گاڑی کے اندر منہ ڈال کر ہم دونوں کو بغور دیکھا اور گیٹ گھول دیا۔ ڈرائیور نے ہمیں عمارت کے مرکزی دروازے پر اتارا۔ عمارت کے اندر ہماری رہنمائی کرتا ہوا ریسپشن (استقبالیہ) تک لے گیا۔ جہاں بیٹھی ہوئی خاتون کو بتایا کہ یہ لوگ ابوعمار کے مہمان ہیں۔ خاتون نے عزّت واحترام کے ساتھ ہمیں بٹھایا اور قہوہ پیش کرتے ہوئے نہایت تہذیبی اور روایتی انداز میں کہا "ابو عمار کے پاس کچھ لوگ دیر سے بیٹھے ہیں۔ بس اب نکلا ہی چاہتے ہیں۔ آپ قہوہ لیجئے۔ یہ کھجوریں تناول فرمایئے۔ آپ نے یہاں تشریف لاکر ہمیں عزّت بخشی"۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ فیضؔ صاحب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ تھے۔ یہاں تک کہ استقبالیہ پر بیٹھی خوبصورت لبنانی خاتون کو دیکھ کر بھی ان کے مزاج کی حُسن پرستی خوابیدہ رہی۔ ہونٹوں پر وہ لطیف مسکراہٹ نہ آئی جوان کی شخصیت کا حصّہ ہے۔ ہم نے آہستہ سے اردو میں کہا: فیضؔ صاحب! یہ کہہ رہی ہے کہ ابوعمار نے آپ کو یہاں سے الجزائر منتقل

کرنے کا انتظام کردیا ہے۔ شاید آپ کو کل ہی روانہ ہونا پڑے۔ فیضؔ صاحب نے چونک کر ہمیں دیکھا اور بولے ''مطلب؟''۔ ہم نے عرض کیا۔ بیروت کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جارہے ہیں نا۔ لیکن یہ کہتے ہوئے ہم اپنی ہنسی کو ضبط نہ کرسکے۔ آخر فیضؔ صاحب بھی ہنس دیئے۔ ایک لطیف مسکراہٹ ان کے لبوں پر انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ کچھ ہی دیر بعد یاسر عرفات اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے۔ علیک سلیک کے دوران فیضؔ صاحب نے ہمارا تعارف کروایا اور کہا کہ: تسلیم الٰہی زلفی ہمارے نوجوان پاکستانی دوست ہیں۔ آجکل بیروت میں قیام پزیر ہیں، سعودی ائرلائنز میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ امریکن یونیورسٹی بیروت سے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کے لیے اپنی ائرلائنز کے بیروت اسٹیشن پر اپنا ٹرانسفر کرالیا ہے۔ جدّہ کے عربی اسکول کے تعلیم یافتہ ہیں۔ بہت اچھے شعر بھی کہتے ہیں۔ اور آپ کو قریب سے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یاسر عرفات نے محبت سے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اھلاً و سھلاً ' شرّفنا کہتے ہوئے اپنے آفس میں داخل ہوگئے۔ اب یاسر عرفات اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے، فیضؔ صاحب ان کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھے اور ہم ذرا فاصلے سے رکھے ہوئے صوفے پر۔ ان دونوں کی یہ میٹنگ کوئی تیس منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران ہم وہاں رکھے عربی کے اخبارات اور رسائل دیکھتے رہے۔ فیضؔ صاحب سے انگریزی میں ضروری بات چیت کے بعد یاسر عرفات ہماری جانب متوجہ ہوئے۔ وہ اس وقت بہت خوشگوار موڈ میں نظر آرہے تھے۔ ہم سے عربی میں مخاطب ہوئے۔ اُن دنوں بیروت میں ہمارے قیام کی غرض وغایت سے آگاہی

حاصل کی۔ پوچھا بیروت کیسا لگا آپ کو۔ ہم نے کہا: اپنے منصبی فرائض کی بجا آوری کے لیے' ہمارا بیروت آنا جانا تو گذشتہ دس سال سے جاری ہے۔ یہ خوبصورت شہر بلا مبالغہ شرق الاوسط کا پیرس ہے۔ یاسر عرفات کہنے لگے "برادر فیضؔ بتا رہے تھے کہ آپ بھی شاعر ہیں۔ میں شعراء کی بہت قدر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ مجھے برادر فیضؔ کا تازہ کلام عربی میں ترجمہ کر کے سنائیں"۔ ہم نے فیضؔ صاحب کی جانب دیکھا۔ انہوں نے فرمایا ٹھیک ہے۔ میں اپنی نظم "فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" سناتا ہوں۔ آپ اس کا عربی میں ترجمہ کردیں:

تیرے اعداء نے کیا' ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

نظم کے یہ دو آخری مصرعے سن کر یاسر عرفات جھوم اٹھے۔ اسی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کر فیضؔ صاحب کو سینے سے لگالیا۔ پھر ہماری جانب گھوم کر کہنے لگے۔ "الاخ زلفی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپ فیضؔ صاحب کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدین کے تناظر میں کہی گئی ہیں۔ ان سب کا عربی میں ترجمہ لکھ کر مجھے بھجوادیں"۔ ہم نے کہا کیوں نہیں یا ابو عمار! یہ تو ہمارے لیے بیحد اعزاز کی بات ہوگی۔ یاسر عرفات کا یہ ذوقِ شعری دیکھ کر ہم نے جھجکتے ہوئے پوچھا: کیا آپ بھی شعر کہتے ہیں؟۔ بولے نہیں' البتہ مجھے شعر بہت یاد ہیں۔ اس دوران فیضؔ صاحب جو ہم دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اردو میں بتایا کہ ابو عمار کو آپ کی نظم بہت پسند آئی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں آپ کی وہ تمام نظمیں جو فلسطین اور اس کے مجاہدین کے تناظر میں لکھی گئی ہیں' عربی میں ترجمہ کر کے انہیں بھجوادوں' جسے یہ

یہاں کے عربی جرائد و مجلات میں شائع کروانا چاہتے ہیں۔ اور انہیں عربی کے بہت سے شعر ازبر ہیں۔ یہ سن کر فیضؔ صاحب نے یاسر عرفات سے درخواست کی کہ آپ بھی اپنی پسند کا کچھ کلام سنائیں۔ زلفی صاحب میرے لیے اس کا اردو ترجمہ کریں گے۔ اب چونکہ یاسر عرفات موڈ میں تھے اور فیضؔ صاحب کی نظم کا سُرور قائم تھا۔ انکساری سے بولے "میں خود تو باقاعدہ شاعر نہیں ہوں البتہ کبھی کبھی تک بندی کر لیتا ہوں۔ میں آپ کو اپنے ان قدیم شعراء کے شعر سناتا ہوں جو زبان زدِ عام ہیں۔ انہوں نے شعر سنانا شروع کیے۔ ایسا لگتا تھا کہ فصاحت اور بلاغت کا دریاء بہہ رہا ہے۔ لیکن جب وہ ابوالعلامعرّیٰ سے ہوتے ہوئے زہیرؔ کے اس شعر پر پہنچے:

وَمَن لم یذُد عن حوضهِ بسلاحهِ

یُهدَم و مَم لا یظلم الناس یظلم

تو یکا یک باہر استقبالیہ پر بیٹھی خاتون نے آ کر بتایا: "یاابوعمار! آپ کے کچھ اور ملاقاتی باہر بیٹھے باریابی کے منتظر ہیں"۔ یہ سن کر ہم نے فیضؔ صاحب کو اشارہ کیا اور ہم دونوں قہوہ کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے یاسر عرفات صاحب سے اجازت طلب کی۔ وہ ہمیں حسب روایت استقبالیہ کے دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ فیضؔ صاحب سے چند باتیں کیں۔ ہمیں عربی ترجمہ بھیجنے کی تاکید کی اور پھر اپنے دوسرے ملاقاتیوں میں گھر گئے۔

فیض احمد فیضؔ کے حوالے سے زلفی صاحب کی اسقدر اہم کتاب اور گفتگو کے بعد ہم نے ان سے دریافت کیا کہ پاکستان میں قیام کے زمانے کی طرح۔ آیا سعودی عربیہ میں بھی آپ کی زندگی میں کوئی ایسا موقع آیا جسے آپ ہمیشہ یاد رکھیں

گے؟۔ ہمارے اس سوال پر زلفی صاحب کے منہ سے بے ساختہ سبحان اللہ نکلا۔ اور یوں گویا ہوئے: ''اِس کرۂ آب و گل پر بسنے والے مسلمانوں کی مجموعی تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے' اگر یہ معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کتنوں کو خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کے اندر جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے خوش نصیبوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔ زہے نصیب کہ اِس سراپا تقصیر کو اُس رب العزت نے اپنے خانۂ کعبہ کے اندر اور آنحضرت ﷺ نے سرہانۂ قبرِ اطہر تک حاضری کا شرف بخشا۔ روحانی پیشواؤں' اہلِ طریقت اور راہِ سلوک کے مسافروں نے حدِ ادب' احترام و احتیاط کے پیشِ نظر' اس نوعیت کی سعادتوں اور مشاہدات و تجربات کو عام کرنے اور لب کشائی سے منع فرمایا ہے۔ اور یہی احترام و احتیاط مانع تھی کہ ہم نے پورے پچیس (۲۵) سال تک اپنے قلم اور زبان کو حاصلِ زیست روح پرور ساعتوں کی مہکتی یادیں لکھنے اور بیان کرنے سے روکے رکھا۔ لیکن اب ہم سوچتے ہیں کہ کیوں نہ اُن حاصلِ زیست روح پرور ساعتوں میں۔ کہ جن کے تصور سے نورانی رِدائیں جگمگانے لگتی ہیں۔ اُن خدا رسیدہ بندوں کی ہدایت کی روشنی میں۔ تمام حدِ ادب' احترام واحتیاط اور اختصار کے ساتھ آپ کو بھی شریک کرلیں۔ یہ وسط جولائی ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ ہم جدّہ انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ''رن وے'' پر واقع' اپنے آفس میں مصروف تھے کہ پاکستان ایمبیسی سے فون آیا۔ ''زلفی صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب عمرہ کے لیے آرہے ہیں۔ لہٰذا آپ کو آج شام ٹھیک پانچ بجے زحمت کرنی ہے اور شاہی قصرِ ضیافت تشریف لانا ہے''۔ لہٰذا ہم وقتِ مقررہ پر' سعودی فرمارواکے شاہی مہمان خانے پہنچ گئے۔ جہاں ہمیں مہمانوں

سے ملاقات کے کشادہ اور نہایت آراستہ ہال میں لیجا کر بٹھا دیا گیا۔ ہمارے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد معلوم ہوا کہ جنرل ضیاء الحق کی خواہش پر امامِ کعبہ الشیخ السبیّل اُن سے ملاقات کے لیے تشریف لے آئے ہیں۔ جن کا استقبال ضیاء صاحب نے مہمان خانے کے دروازے پر کیا اور اور ان کا ہاتھ تھامے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ قصہ کوتاہ جنرل صاحب اور امامِ کعبہ میں گفتگو شروع ہوئی۔ جو باہمی خیر' خیریت' اسلامی ممالک میں آپس کی چپقلشوں' عرب ریاستوں کے اتفاق و اتحاد کی ضرورت' غیر عرب اور غریب اسلامی ممالک کی امداد' ان ممالک میں صنعتوں اور عصری و دینی تعلیمی اداروں کے قیام کی ضرورت' سے ہوتی ہوئی جب پاکستان میں اسلامی نظام (نظامِ مصطفیٰ) اور وہاں کے عوام کے بنیادی حقوق کی بحالی تک پہنچی تو اُس موقع پر امامِ کعبہ نے ہم سے کہا کہ۔ ''آپ ضیاء صاحب کو میری یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ۔ اسلام نے جب روئے زمین پر پہلا قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کی بحالی کا اعلان فرمایا۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ پاکستان کے عوام بالعموم اپنے اس حق سے محروم ہیں۔ آپ اسلامی نظام لانے سے پہلے اپنے ملک میں اسلامی جمہوریت اور عوام کے بنیادی حقوق بحال کریں۔ پھر سیاسی اور سرکاری اداروں میں صنعت کاروں' زمیں داروں' تاجروں اور سرمایہ داروں یا ان کے خریدے ہوئے نمائندوں کی شمولیت کو ممنوع قرار دیئے جانے کو اپنے آئین میں تحریر کریں۔ اب تک ملک سے جو کچھ لُٹ چکا ہے' اس کی وصولی یا واپسی پر وقت ضائع ہرگز نہ کریں۔ ہمارے ہاں عربوں میں ایک کہاوت ہے کہ۔ ڈاکو سے لُوٹا ہوا مال لوٹا دینے کی توقع بے وقوفی ہے''۔

امام صاحب کو رخصت کرنے کے بعد جنرل ضیاء الحق ہماری جانب پلٹے۔ اور کھڑے ہی کھڑے ہماری ''عربی دانی'' کی تعریف کی اور چند تشکرانہ اور ستائشی جملوں کے بعد اپنے مخصوص انداز میں ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت شائستہ اور نرم لہجے میں کہا۔ ''زلفی صاحب! امام صاحب سے ہماری اس گفتگو کی کوئی بھی بات۔ آپ باہر بیٹھے ہوئے میڈیا والوں کو نہیں بتائیں گے''۔ ہم نے کہا۔ صدر صاحب! پاکستانی آفیشلز کی عربی/اردو ترجمانی کا' ہمارے لیے یہ پہلا موقع نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہم کسی کو کوئی بات نہیں بتائیں گے۔ ضیاء صاحب نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب ہم مکۃ المکرّمہ عمرہ کرنے جارہے ہیں اور وہاں سے مدینۃ المنورہ روضۂ رسول ﷺ پر سلام پیش کرنے کے لیے جائیں گے''۔ ہم نے عرض کیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں!۔ ضیاء صاحب نے ہمیں غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ ''آپ تو بچپن سے یہاں ہیں۔ اور ہزاروں بار جا چکے ہیں' ہم گنہگاروں کے ساتھ جا کر کیا مِلے گا!''۔ ہم نے عرض کیا۔ خانۂ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کے اندر جانے کی تمنا ہے۔ جو آپ کی معیت ہی میں پوری ہو سکتی ہے۔ ضیاء صاحب نے ایک بار پھر ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''تو ٹھیک ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے''۔ اور اس طرح ہم' ضیاء صاحب کے ساتھ آئی ہوئی ان کی فیملی اور مختلف وزراء' سرکاری افسران اور سفارت خانے کے چند لوگوں کے ساتھ مکۃ المکرّمہ روانہ ہوئے۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی تمنا کو یوں اچانک پورا ہوتے دیکھ کر۔ ہماری جو کیفیت تھی' اُس کا اظہار ہم لفظوں میں کبھی نہ کر پائیں گے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے' ہم کب حرمِ مکّی کے صدر دروازے پہنچے۔ ہمیں پتا

ہی نہ لگا!!۔ باب عبدالعزیز سے حرم میں داخلے کے بعد ہم سب نے دو رکعت نماز تحیۃ الحرم پڑھی۔ اِدھر ہم نماز سے فارغ ہوئے۔ اُدھر حرم کے خدمت گاروں نے بابِ کعبہ پر سیڑھی لگادی۔ اور کعبے کے کلید بردار نے اوپر جا کر۔ بابِ کعبہ وا کیا۔ دوسرے خدمت گار نے اندر جا کر شمعیں روشن کیں۔ تیسرے نے عود سُلگایا۔ پھر سیکیورٹی آفیسروں نے جا کر اندر کا جائزہ لیا۔ اس دوران ہم سب کے گرد شاہی سکیورٹی گارڈ حلقہ بنائے کھڑے رہے۔ چند لمحوں کے بعد کعبے میں داخلے کا اشارہ ملا۔ اور ہم سب ایک قطار میں ضیاء صاحب کے پیچھے۔ لرزیدہ قدموں سے سیڑھی کی جانب بڑھے۔ یہاں ہم آپ کو ایک بات بتاتے چلیں کہ ضیاء صاحب کے ساتھ جانے والے مرد اور عورتوں کی کل تعداد پچیس (۲۵) تھی۔ لیکن خانۂ کعبہ کے اندر، ہم سمیت صرف نو (۹) مرد گئے۔ باقی سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ہی۔ خاموشی سے لائین سے الگ ہو گئے !!۔ دوسروں کی تو ہم کیا کہیں۔ ہماری اپنی بھی وہ کیفیت تھی کہ قدم لرز رہے تھے۔ آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔ سیڑھیاں طے کر کے جب کعبے کے دو میٹر چوڑے سنگِ در پر دایاں قدم رکھا تو ہمیں چوکھٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اور اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ خانۂ خدا میں داخل ہونے پر پہلی نظر (۱۴) میٹر اونچی چھت کو اٹھائے ہوئے، درمیان میں لگے لکڑی کے تین ستونوں پر پڑی۔ جبکہ فرش پر بھاری قسم کے ٹائل لگے ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ کعبہ چوکور نہیں ہے۔ کہ چاروں دیواریں ایک دوسرے سے مختلف پیمائش رکھتی ہیں۔ لہٰذا مجموعی طور پر کعبے کا اندرونی حدود اربعہ تقریباً دس میٹر ہے۔ ہم لوگ جیسے ہی کعبے میں داخل ہوئے تو ہمیں دائیں جانب کونے میں بنے، تقریباً ڈیڑھ میٹر چوڑے

اور تقریباً ڈھائی میٹر لمبے کمرے کی جانب لے جایا گیا' جسے باب التوبہ کہتے ہیں۔ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک ایک کر کے ہم اس کے اندر گئے اور دو رکعت نفل ادا کیے۔ اور گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی معافی طلب کی۔ توبہ کی۔ کہ اُس وقت دل و دماغ کی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ توبہ کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ آنسو تھے کہ مسلسل جاری تھے۔ زبان تھی کہ لڑکھڑا رہی تھی۔ پورے بدن پر کپکپی سی طاری تھی۔ کوئی دعا۔ کوئی آرزو۔ کوئی تمنا۔ یاد نہیں آ رہی تھی۔ ''غرفۂ توبہ'' سے نکل کر کعبے کے باقی تینوں کونوں میں دو دو رکعت نفل ادا کیے۔ ابھی چونکہ ہمارے پیچھے آنے والے تین لوگ نفل ادا کر رہے تھے' لہٰذا ہم کعبے کے وسط میں لگے ستون کو تھام کر بیٹھ گئے۔ اور پھر رنگ و نور کی وہ چکا چوند ہوئی کہ ہمیں ہوش نہ رہا۔ کہ نہ جانے کتنی دیر بعد جب کسی نے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر واپسی کے لیے کہا تو ہمیں ہوش آیا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سیڑھی اتر کر مقامِ ابراہیمؑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اور جب نظر اٹھا کر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ تو سب ہی کو اسی کیفیت میں پایا۔ اللہ اکبر۔

اب ہماری اگلی منزل مدینۃ المنورہ تھی۔ جہاں روضۂ رسول ﷺ میں زیارتِ قبرِ اطہر نصیب ہونے والی تھی۔ مدینۃ المنورہ جانے والوں کی تعداد اب (۲۳) رہ گئی تھی کہ صدر صاحب کے ساتھ آئے ہوئے وفد میں سے ایک صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی اور ایک صاحب سفارت خانے کے عملے سے نہ جا سکے۔ لہٰذا قبرِ اطہر کی زیارت ہم (۲۰) مردوں کو نصیب ہوئی کہ خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ حرمِ مدنی میں ہم بابِ جبرئیل سے داخل ہوئے۔ روضۂ رسول ﷺ میں پہنچنے کے بعد جانبی

دروازہ کھول دیا گیا۔ پہلے دو خدمت گاروں نے اندر جا کر عود سلگایا۔ ان کے بعد سکیورٹی گارڈ اندر گئے۔ اور تیسرے مرحلے میں ہم لوگوں کو اندر جانے کے لیے کہا گیا۔ ہم (۲۰) لوگ دو قطاروں میں ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑے تھے۔ سب سے آگے صدرِ پاکستان تھے۔ ہم روضۂ اطہر میں جیسے ہی داخل ہوئے۔ تو ایسا لگا جیسے کسی پُر نور غرفۂ تقدس میں آ گئے ہوں۔ یکا یک روح الستُ بر بکم سے بالیدہ ہوگئی۔ کیا سکون تھا۔ کیا پاکیزگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نہایت شفیق اور مہربان ہستی نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ نہ خوف۔ نہ بدن کا لرزہ۔ نہ زبان میں لڑکھڑاہٹ۔ السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ نہایت روانی سے وردِ زبان تھا۔ لیکن سرتاپا احترام حدِ ادب اور عاجزی طاری تھی۔ دل تھا کہ کسی معصوم بچے کی طرح ہمک ہمک کر مرقدِ پُر نور سے لپٹ جانے کے لیے بیتاب تھا۔ عجب جذب و کیف کا عالم تھا۔ سبحان اللہ پلک جھپکتے لب و روح کی ساری کثافتیں دُور ہو گئیں۔ چند قدم آگے بڑھے تو دیکھا کہ روضۂ رسول ﷺ کی کشادہ دیواروں اور بلند و عریض ستونوں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ ہر طرف چھت کے قریب سنگِ مرمر کی جالی والے کشادہ روشندان ہیں۔ روضۂ مبارک کی چھت پر قیمتی فانوس لٹک رہے ہیں۔ فرش پر سرخی مائل قیمتی اور دبیز قالین بچھے ہیں۔ چند قدم اور آگے بڑھے۔ تو آنکھوں میں نور بھر گیا۔ سامنے سرکارِ دو عالم ﷺ کی مرقدِ اطہر تھی۔ سبحان اللہ۔ السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا حبیب اللہ وردِ زبان تھا۔ اور دل گواہی دے رہا تھا کہ حضور ﷺ وعلیک السلام یا ابنی کہہ رہے ہیں۔ قبرِ اطہر پکی ہے۔ لیکن اس پر

صندل کی لکڑی کا مستطیل صندوق؛ جس پر مکان کی چھت کے انداز میں کوئی چھ فٹ کا تکون ابھار ہے۔ اس کے اوپر گہرے سبز رنگ کی مخملی چادر۔ جس پر سونے کے تاروں سے آیاتِ قرآنی کڑھی ہوئی ہیں۔ سرہانے کی نشان دہی کے لیے حضورﷺ کا عمامۂ رکھا ہے۔ ہم سب حضورﷺ کے سرہانے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑے سلام پیش کرر ہے تھے۔ اور ہماری دبی دبی سسکیاں روضۂ اطہر کی گہری اور مقدس خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ اُسی کیفیت میں ہم حضورﷺ کے سرہانے کے بالکل قریب چلے۔ اتنا قریب کہ بے ساختہ عمامۂ مبارک کے لٹکے ہوئے حصہ کو اپنے دائیں ہاتھ میں تھام کر پہلے اپنے لرزتے لبوں سے بوسہ دیا۔ اور پھر۔ اپنی اشکوں بھری آنکھوں سے لگالیا۔ اور ہمارے آنسو اُس عمامۂ مبارک میں جذب ہو گئے۔ اس تمام عمل کے دوران جس بات نے ہمارے ایمان کو تازہ کر دیا۔ وہ اس مونگیا رنگ کے عمامۂ مبارک کی تازگی تھی۔ یعنی چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود بھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا کپڑا بالکل نیا ہے۔ اس کے لمس کی تازگی۔ تقدس بھری پاکیزگی۔ یہ احساس کہ اسے حضورﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے استعمال فرمایا ہے۔ اور اس میں بسی حضورﷺ کے بدنِ اقدس کی خوشبو۔ جو آج تک ہمارے اِن ہاتھوں میں مہک رہی ہے۔ سبحان اللہ!"

زلفی صاحب سے روح پرور ساعتوں کی باتیں سن کر ہم پر بھی جذب و روحانی بالیدگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ چند لمحوں تک ہم بھی آنکھیں بند کیے۔ اُن مقاماتِ مقدسہ کے تصور میں کھوئے رہے۔ لہٰذا اس جذباتی کیفیت سے نکلنے کے لیے ضروری تھا کہ اس گفتگو کو وقفہ دیا جائے۔ اور اس دوران ہم نے زلفی صاحب کے ہزاروں گرانقدر کتابوں سے آراستہ کتب خانے پر نظر ڈالی۔ جس میں دنیا کے

ہر موضوع، ہر علم، ادب، ہنر، سائنس، تاریخ، تہذیب وثقافت اور مذہب پر نامور اہلِ قلم کی مشہور اور دو دو تین تین سو سال پرانی کتابیں موجود ہیں۔ جو نہ صرف اردو بلکہ انگلش، عربی اور فارسی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ کہ زلفی صاحب کو ان تمام زبانوں پر تعلیمی عبور حاصل ہے۔ تسلیم الٰہی زلفی کے اسی ذاتی کتب خانے کے ایک کونے میں لگی شیلف پر رکھے وہ درجنوں ایوارڈ، گولڈ میڈل، شیلڈ، اسناد اور وثیقۂ اعترافِ کمال دیکھے جو زلفی صاحب کو ۱۹۶۵ء سے لے کر آج تک دنیا بھر کے بڑے علمی، ادبی، سماجی اور سرکاری اداروں کی جانب سے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ جبکہ اسی کتب خانے کی چہار اطراف دیواروں پر آویزاں، ہم نے درجنوں کے حساب سے وہ نادر اور تاریخی تصاویر بھی دیکھیں۔ جن میں اپنی نوعمری سے لے کر آج تک تسلیم الٰہی زلفی دنیائے علم و ادب کے اکابر اور درخشندہ ستاروں کے ساتھ مختلف مشاعروں، کانفرنسوں اور سیمناروں وغیرہ میں شریک ہیں۔ ائر لائنز میں اپنی منصبی ذمّہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء سے تسلیم الٰہی زلفی کی دنیا کے جن چھبیس (۲۶) ممالک میں تواتر سے آمد و رفت رہی ہے ان میں: انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس، سوئزر لینڈ، یونان، ڈنمارک، سوئیڈن، ناروے، اٹلی، ترکی، مصر لبنان، سوڈان، خلیجی ریاستیں، سعودی عربیہ، چین، جاپان، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، انڈیا اور پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح، انہوں نے ان تمام ممالک کے تاریخی، ثقافتی، سماجی، علمی، ادبی، سیاسی اور فنی مظاہر کا اپنے زاویۂ نگاہ سے جائزہ لیا۔ اس عمل نے ان کے علم کو وسعت، فکری کو بلندی، شعوری کو پختگی، دانش کو رسائی اور قلب کو وسعت دی۔ سادگی، وضعداری، انکساری اور معاونت ان کا مزاج بن گئی۔ لہٰذا زلفی صاحب کے انھی

اوصاف کا مظاہرہ ہم ان کے فن پاروں اور عملی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ تسلیم الٰہی زلفی کی یہی سیاحت، دنیا بھر کے منتخب شہروں پر "سیاحی نظموں" کی صورت، جب "آگرہ سے نیاگرہ" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ تو اہلِ ہنر اور اہلِ ذوق نے ان سیاحی نظموں کو بیحد سراہا۔ یہاں ہم چاہیں گے کہ چند نظمیں آپ کو بھی پڑھوائیں:

## فرینکفرٹ

نیکر کے کنارے سے دیکھو، وہ ڈوبتے سورج کا منظر
سامان سے بوجھل ہر کشتی، وہ رنگ برنگے اسٹیمر
یہ گولف کا میدانِ یکتا، شیلاؔس کے سبزہ زاروں میں
جو حُسن نظر آتا ہے یہاں، وہ حُسن کہاں گلزاروں میں
طرزِ یورپ اور امریکا سے دُور یہاں کی عورت ہے
اخلاق و وفا و خدمت میں، مشہور یہاں کی عورت ہے
فنکار سبھی بیتھوونؔ کی موسیقی کے گن گاتے ہیں
وہ آج نہیں، پر آج تلک، سب لوگ اُسی دھن گاتے ہیں

گو آج گوئٹےؔ ہم میں نہیں، افکار تو اس کے باقی ہیں
یہ گلیاں، یہ بازار، 'ڈگر' گھربار تو اس کے باقی ہیں
اقبالؔ کی عظمت کے ہم کو آثار یہاں بھی ملتے ہیں
دو چار حکیم الامت کے بیمار یہاں بھی ملتے ہیں

اک چنگاری شعلہ بن کر' افلاک کے تارے تک پہنچی
اقبالؔ کی فکر تو راویؔ سے نیکرؔ کے کنارے تک پہنچی
اِس قوم نے ہم کو بتلایا' کچھ قرض ہنر پر ہوتے ہیں
عظمت کے بام و در یوں بھی' تعمیر کھنڈر پر ہوتے ہیں
تھے جرمنؔ محوِ پیراکی' اور ہم کو ہمارے یاد آئے
راویؔ کے زندہ دل' زلفیؔ! نیکرؔ کے کنارے یاد آئے

## نیو یورک

بلند و بالا عمارتوں کا نگر تو ویسے بڑا حسیں ہے
مگر یہاں کا عجب چلن ہے کہ ایک دوجے کا غم نہیں ہے
جسے بھی دیکھو رواں دواں ہے' نہ رک کے مِلنا' نہ بات کرنا
مشین انسان بن گیا ہے' یہ دن کو کرنا' وہ رات کرنا
تمام ہفتے کی ہر مشقت' شبینہ خانوں میں بھول جانا
تھرکتے' قدموں' بہکتی سانسوں' کسی کی باہوں میں جھول جانا
سروں پہ بادل اٹھائے اونچی عمارتیں شان سے کھڑی ہیں
کبھی ہواؤں' کبھی گھٹاؤں' کبھی یہ طوفان سے لڑی ہیں
وہ دیوقامت' وہ جسمِ آہن' مجسمہ جو ہے سبز رنگی
رکھا جزیرے کے درمیاں جو' وہی ہے اسٹیچو آف لبرٹی

یہیں ہے یو این او کی بلڈنگ، کنارے آبِ رواں کے واقع
قرار دادیں ہیں اس کی ''ویٹو'' ہر ایک ہے دوسرے کا قاطع

ہمارا کشمیر منتظر ہے خوش آئند فیصلے کا کب سے
ہے التواء میں پڑا ہوا حل ہمارے اس مسئلے کا کب سے
تمام کٹھ پتلیوں کی ڈوری یہیں کہیں سے تو ہل رہی ہے
ہے پابہ زنجیر سارا عالم، عجیب اندازِ خسروی ہے
بنی ہے مرکز ہماری چاہت کا یہ زمیں جو بہت حسیں ہے
مگر ہمارا یہ تجربہ ہے کہ اس میں بوئے وفا نہیں ہے

## جنیوا

پہاڑ اپنے سروں پہ تاج برفانی سجاتے ہیں
جنیوا جھیل میں ہر سمت تارے جھلملاتے ہیں
یہ کوہِ ایلپسؔ، یہ سبزہ زار و وادیاں ہر سُو
پرانی وضع کے کاٹیج، دریا، گھاٹیاں ہر سُو
غرورِ حُسن، نشۂ جوانی، جسم کے سودے
کوئی حیرت نہیں، زاہد یہاں ایماں اگر کھودے
سنہری کلَسوں والا کلیسا جگمگاتا ہے
یہاں ہر مذہب و مسلک کا انساں کھنچ کے آتا ہے

ہلال احمر نے خدمت کی یہاں بنیاد رکھی تھی
یہیں اقوامِ متحدہ نے پہلی بار میٹنگ کی
یہ روسو اور اسٹالن کی، پطرس کی نشانی ہے
یہیں پاسچو، ملٹن کا بچپن ہے، جوانی ہے
یہ امن و آشتی کے پوجنے والوں کی بستی ہے
یہاں آزاد رندی ہے، مگر پابند مستی ہے
یہاں کے بینک ہیں مشہور اپنی راز داری میں
بہت مشاق ہوتے ہیں یہ 'کالے دھن' کی یاری میں

جنیوا! تیری شادابیٔ فطرت دل لبھاتی ہے
مگر ہمکو مری منظر بہ منظر یاد آتی ہے

سعودی عرب میں رہائش کے دوران تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے برِ صغیر پاک و ہند کے علاوہ دنیا بھر میں قائم علمی ادبی مراکز کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے علمی اور ادبی اجتماعات میں پابندی کے ساتھ شرکت فرمائی ہے۔ اسی تناظر میں جب ہم نے ان سے کسی اہم اور یادگار موقع کے حوالے سے ان کی یادیں تازہ کرنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے فرمایا: ''ہوایوں کہ جب امجد اسلام امجد کی فلسطینیوں پر کہی ہوئی نظموں کا مجموعہ ''فشار'' شائع ہوا' تو انہوں نے ہمیں یہ کتاب اور اپنی تازہ تصویر اور ایک خط کے ساتھ سعودی عرب بھیجی کہ۔ ''آپ اِس پر عربی میں تبصرہ لکھ کر اپنے ہی ہاں کسی عربی رسالے میں شائع کروادیں''۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب ہم اپنے

جاب کی کسی ٹریننگ میں مصروف تھے۔ لہٰذا فوری طور پر امجد کی کتاب پر تبصرہ نہ لکھ سکے۔ البتہ انہیں لاہور فون کر دیا کہ پہلی فرصت میں یہ کام کر دیں گے۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ ٹریننگ کے بعد ہم کسی اور پراجیکٹ میں پھنس گئے اور تبصرے والا کام التواء میں پڑ گیا۔ اب اسے اتفاق کہیئے کہ انہی دنوں ہمیں حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام اسلام آباد میں ہونے والی ''مقتدرہ قومی زبان'' کی سہ روزہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا کہ ''اردو زبان میں ترجمے کے مسائل'' کے موضوع پر ہمیں بھی پیپر پڑھنا ہے۔ لہٰذا ہم اس کی تیاریوں میں لگ گئے۔ اور تاریخِ مقررہ پر اسلام آباد پہنچ گئے۔ یہاں ہم ایک بات اور بتاتے چلیں کہ ہمارے اسلام آباد جانے سے ایک ماہ قبل مولانا کوثر نیازی ہمارے پاس جدّہ کا چکر لگا کر گئے تھے۔ اور بتایا تھا کہ ان کا شعری مجموعہ ''لمحے'' پریس میں ہے اور بس چھپ کر آنے والا ہی ہے۔ لہٰذا اُس سہ روزہ کانفرنس کے پہلے ہی دن مولانا کوثر نیازی نے ہمارے اعزاز میں عشایئے کا اہتمام کر دیا۔ اس طرح دوسرے دن ملک بھر کے اخبارات میں جہاں اُس کانفرنس کے حوالے سے خبریں شائع ہوئیں۔ وہاں مولانا کوثر نیازی کے اُس عشایئے کی خبر بھی لگ گئی کہ جس میں۔ مولانا کوثر نیازی نے جہاں تمام معروف اہلِ قلم اور چند اپنے ساتھی سینیٹرز کو بھی بلایا گیا تھا' وہاں کانفرنس میں آئے ہوئے' روزنامہ جنگ کے میر خلیل الرحمٰن' اردو ڈائجسٹ کے الطاف حسن قریشی' ویکلی 'حرمت' کے ایڈیٹر زاہد ملک وغیرہ کو بھی مدعو کیا تھا۔ چونکہ مولانا کو معلوم تھا کہ یہ تمام حضرات اپنی جدۃ آمد پر میرے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ لہٰذا ہم لوگ کافی دیر تک جدۃ کی باتیں کرتے رہے۔ لیکن جب یہ سلسلہ دو گھنٹے سے تجاوز کر گیا تو میز کے گرد بیٹھے ہوئے باذوق سینیٹرز پہلو بدلنے لگے

اور مولانا کوثر نیازی سے احتجاج کیا کہ۔ ''جناب اب زلفی صاحب سے کچھ سنوائیے تو سہی''۔ یاد رہے کہ اُس وقت جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی۔ وہ جگہ اسلام آباد تھی۔ اور 'طباق ریسٹورانٹ' میں ہمارے اطراف بیٹھے ہوئے تقریباً سارے ہی سرکاری عہدے دار۔ مگر مولانا کوثر نیازی کہاں چوکنے والے تھے۔ اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے بولے۔ ''جی ہاں ضرور' لیکن میں زلفی صاحب کا میزبان ہوں' لہٰذا پہلے میں سناؤں گا''۔ اور پھر گویا ہوئے۔

حکمرانوں سے کہو ہوش میں آئیں کوثرؔ
ہم بھی بیٹھے تھے کبھی ایسے ہی ایوانوں میں

پھر کہنے لگے۔ پاکستان کے حکمران پورے ملک میں تو اسلام نافذ نہ کر سکے۔ البتہ دارالحکومت میں۔ اسلام۔ آباد۔ کرلیا ہے۔ اپنے کلام کے بعد مولانا نے ہم سے کچھ سنانے کے لیے کہا۔ لہٰذا ہم نے بھی سرکاری عہدے داروں کی جانب رخ کر کے اپنی چار لائینیں ''داغ'' دیں:

خوب دستورِ چمن ہے سبزہ و گل کو یہاں
خوفِ نادیدہ خزاں میں مبتلا رکھا گیا
وہ جو اُڑ سکتے تھے' اُن پر بندشِ پرواز تھی
طائرانِ پر بریدہ کو کھلا رکھا گیا

مولانا کوثر نیازی اور ہمارے اشعار سن کر' جب سرکاری عہدے دار پہلو بدلنے لگے اور خفیہ ادارے کے مخبر کے کان کھڑے ہوگئے تو۔ الطاف حسن قریشی صاحب نے اشارے سے ہمیں احتیاط برتنے کو کہا اور سلطان رشک نے جلدی سے

ہماری ایک رومانوی نظم کی فرمائش کردی۔ مولانا کوثر نیازی جو۔اب تک ان لوگوں کے اشارے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔آخر بول پڑے۔ ''حضرات! زلفی صاحب میرے مہمان ہیں۔آپ انہیں کیوں روک رہے ہیں۔اور گل وبلبل والی شاعری کی فرمائش کیوں کر رہے ہیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ان سیاست دانوں اور حکمرانوں نے مجھے تو پہلے ہی مار ڈالا ہے۔مجھ سے میری شناخت بھی چھین لی ہے۔چونکہ:

کوثرؔ کہ ایک شاعرِ شیریں سخن بھی تھا

مدّت ہوئی وزیر بنا اور مرگیا!

خیر۔ دوسرے دن کے اجلاس میں شرکت کے بعد جب سلطان رشک ہمیں اپنے ''نیرنگِ خیال'' کے دفتر لے گئے تو کچھ دیر کے بعد پروین شاکر کا فون آ گیا کہ۔کل کانفرنس کے آخری اجلاس میں شرکت کے بعد آپ ہمارے ساتھ لاہور چل رہے ہیں' جہاں ایوب خاورؔ نے آپ کے اعزاز میں مشاعرے کا اہتمام کیا ہے' لیکن جب ہم نے پروینؔ کو بتایا کہ ہم محض پانچ دن کی چھٹی پر آئے ہیں اور ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ لاہور جا سکیں تو انہوں نے بحث شروع کردی اور قدرے ناراضگی کا اظہار کیا اور چونکہ اُس وقت ان کے پاس امجد اسلام امجدؔ بھی موجود تھے (جو اپنی کتاب پر ہمارے عربی تبصرے میں تاخیر کے سبب شاید ناراض تھے) تو انہوں نے پروینؔ سے کہا کہ زلفی مصروف آدمی ہیں تم کیوں انہیں مجبور کر رہی ہو۔امجدؔ کے اتنا کہنے پر پروینؔ اور بھڑک اٹھیں۔جس پر امجدؔ لطف لیتے رہے۔ بہر حال بڑی مشکل سے ہم نے انہیں ٹھنڈا کیا اور اس مسئلے پر اگلے دن کانفرنس کے آخری اجلاس کے بعد بات کرنے کا طے پایا۔اُس وقت وہاں ہمارے ساتھ سیّد

ضمیر جعفری بھی موجود تھے' جو اجلاس کے بعد ہمارے ساتھ ہی آ گئے تھے۔ لہٰذا ہم نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ان کی مدد مانگی۔ تو انہوں نے کہا آپ فکر نہ کریں میں معاملے کو سنبھال لوں گا۔ اور رہی بات مشاعرے کی تو میں آپ کے اعزاز میں کل اپنے گھر نشست رکھ لیتا ہوں۔ اس پر سلطان رشک نے کہا۔ نہیں زلفی صاحب کے اعزاز میں عشائیے اور نشست کا اہتمام تو میں کل ادارہ ''نیرنگِ خیال'' کی جانب سے کر رہا ہوں۔ دوسرے دن کانفرنس کے اختتام پر ہم نے پروین کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ نہ مانیں۔ یہاں تک کہ سیّد ضمیر جعفری کی مداخلت بھی بے کار رہی۔ اور وہ واپس چلی گئیں۔ ہاں البتہ جاتے جاتے ہم سے یہ کہہ گئیں کہ عطاء الحق قاسمی عمرہ کے لیے جدّہ جا رہے ہیں۔ اگر آپ ''مصروف'' نہ ہوں تو وہاں ان کے اعزاز میں مشاعرے کا اہتمام کر دیں۔ لہٰذا جب عطاء الحق قاسمی جدّہ آئے تو نورین طلعت عروبہ کے تعاون سے ان کے اعزاز میں ایک یادگار محفل سجائی گئی۔ البتہ پروین کی ناراضگی پھر بھی قائم تھی!!۔ لیکن بھلا ہو شمالی امریکا کی ادبی انجمنوں کا کہ اگلے ہی سال انہوں نے Chain مشاعروں کا اہتمام کیا' جس میں پاکستان سے جمیل الدین عالیؔ' پروین شاکرؔ' امجد اسلام امجدؔ' لندن سے افتخار عارف اور سعودی عرب سے ہم مدعو تھے۔ اس طرح تقریباً ایک سال بعد ہم پانچوں لوگ پھر یکجا ہوئے۔ اور اس مرتبہ معمولی گلے شکوے کے بعد پروینؔ نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا۔ لیکن اب کیا کیا جاتا اس اتفاق کو کہ ہمارے گروپ کے افتخار عارف سے پروینؔ کی تو تو میں میں کی وجہ سے ایک بار پھر پروین کا موڈ آف ہو گیا۔ خیر بات ہو رہی تھی مقتدرہ کی سہ روزہ کانفرنس کے حوالے سے۔ تو کانفرنس کے اختتام پر پروین

شاکر نے احمد ندیم قاسمی صاحب کو لاہور فون کیا اور کہا۔ ''عمو! اس لمبے چوڑے پروگرام میں آپ کہیں دکھائی نہیں دیئے!!''۔ پروینؔ کی اس بات سے قاسمی صاحب کو بیحد دکھ ہوا۔ لہٰذا انہوں نے پروینؔ کو خط لکھا کہ۔ ''میں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے کسی کو بھی کانفرنس میں شمولیت سے نہ روکا۔ البتہ میرے اندر دوستی اور محبت کا پندار بیدار رہا اور جو کہتا رہا کہ میرے فلاں فلاں دوست اور خاص طور سے پروینؔ بیٹی تو' اس کانفرنس میں شمولیت سے انکار کر دے گی؛ جس میں شمولیت سے میں نے انکار کر دیا تھا۔ مگر تم شامل ہوئیں!۔ اور مجھے اس کا دکھ ہوا۔ جس کا اظہار میں نے تسلیم الٰہی زلفی سے بھی کیا۔ بیٹی! کانفرنس میں تمہاری شرکت سے مجھے منصور حلاجؔ یاد آ رہا ہے' جو لوگوں کے پتھر کھا رہا تھا' مگر چپ تھا۔ البتہ جب اس کے ایک اپنے نے اس پر ایک پھول' پتھر کی طرح پھینکا تو وہ بلک اٹھا۔''

علمی' ادبی دنیا کی بڑی اور ممتاز شخصیات سے ربط و تعلق کے ضمن میں اور اجتماعات میں شرکت کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء کی دھائی میں۔ لاہور' تسلیم الٰہی زلفی صاحب کا گھر آنگن ہوا کرتا تھا۔ آپ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تھے' تو اپنے بزرگ اور ہم عمر احبابِ ادب سے ملاقات اور ادبی اجتماعات میں شرکت کی غرض سے لاہور اور اسلام آباد کا چکر ضرور لگاتے تھے۔ لہٰذا زلفیؔ صاحب سے ہمارا اگلا سوال یہی تھا کہ اپنی ذات سے متعلق' اُس دور کی کچھ اہم یادوں میں ہمیں بھی شریک فرمائیں۔ لہٰذا وہ گویا ہوئے: ''احمد ندیم قاسمی صاحب کے دقیق اور اعلیٰ ادبی مجلّے ''فنون'' میں ہمارے لکھنے کی ابتداء ۱۹۷۰ء کے اواخر میں بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ ہم اپنے ادبی دوستوں سے ملنے لاہور گئے۔ لہٰذا ایوب

خاور نے اپنے گھر ''شامِ زلفی'' کا اہتمام کیا' جس میں احمد ندیم قاسمی کے علاوہ اجمل نیازی' نجیب احمد' خالد احمد' حسن رضوی اور اسلم کمال وغیرہ کو اکھٹا کیا۔ خیر کھانے کے بعد محفلِ شعروسخن جمی' جس میں ہمارے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ صرف ہمیں سنا گیا۔ اور اتنا سنا گیا کہ ہم سناتے سناتے تھک گئے۔ جس کے بعد ایوب خاور نے ہمارے ہاتھ سے تمام غزلوں کے پیپر باقاعدہ چھین کر احمد ندیم قاسمی صاحب کے حوالے کر دیئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اُس وقت تک ہم نے قاسمی صاحب کے مجلّے ''فنون'' میں لکھنا شروع نہیں کیا تھا' اور پنجاب کے پرچوں میں صرف: اوراق' ادبِ لطیف اور نیرنگِ خیال ہی میں لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا جب ایوب خاور نے ہماری غزلیں قاسمی صاحب کے حوالے کیں تو انہوں نے پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا۔ میں انہیں ''فنون'' کی زینت بناؤں گا۔ ساتھ ہی شکایتی انداز میں کہا کہ۔ زلفی صاحب نے تو آج تک ہمیں کچھ بھیجا ہی نہیں!!۔ اور اپنی اس بات سے اُن کا اشارہ اپنے حریف ڈاکٹر وزیر آغا کے مجلّے ''اوراق'' کی جانب تھا' جس میں ہم پابندی سے چھپ رہے تھے۔ جو کہ' قاسمی صاحب کا پہلا ہدف اور ''ادبی مورچہ'' تھا۔ اب قاسمی صاحب نے شکایت کر کے صورتِ حال ایسی پیدا کر دی تھی کہ ہمیں بولے بنا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے عرض کیا کہ قاسمی صاحب! آپ دو بڑوں کی جنگ میں ہم مبتدیوں کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ آخر آپ نے تمام شاعروں اور ادیبوں پر یہ پابندی کیوں لگا رکھی ہے کہ جو ''فنون'' میں لکھے وہ ''اوراق'' میں نہیں لکھ سکتا!! جبکہ دوسری طرف وزیر آغا صاحب نے اپنے پرچے میں لکھنے والوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ جس کا ثبوت اِس وقت آپ کے ہاتھ میں میری غزلیں ہیں۔ جبکہ میں ایک عرصے

سے ''اوراق'' میں لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ غیر ارادی یا ارادی طور پر ایسا کر کے آپ نے اہلِ قلم کو دو گروپس میں بانٹ دیا ہے!۔ اور نتیجتاً ہر دو گروپس کے لوگ تخلیقِ ادب کی بجائے اپنی تخلیقی صلاحیتیں ایک دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالنے میں صرف کر رہے ہیں!!۔ جو کہ ہر باشعور لکھنے والے کے لیے باعثِ تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو عمرِ خضر دے۔ لیکن آپ کے بعد کیا ہوگا۔ کیا یہ گروپس کبھی یکجا ہو سکیں گے!؟۔ ہمارے اس احتجاج پر قاسمی صاحب نے فرمایا۔ نہیں میں نے تو کبھی کسی پر پابندی نہیں لگائی، جس کا ثبوت آپ کی یہ غزلیں ہیں، جواب میں ''فنون'' میں چھاپوں گا، جبکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ ''اوراق'' میں بھی لکھتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا چلیں آپ نے پابندی نہیں لگائی، لیکن جو لوگ آپ کے ہاں لکھتے ہیں، وہ آپ کی خوشنودی حاصل کرنے اور خود کو آپ کے گروپ کا ظاہر کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز ''اوراق'' کو نہیں دیتے۔ اسی طرح دوسری طرف ''اوراق'' میں لکھنے والے، وزیر آغا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ''فنون'' میں نہیں چھپتے اور خود کو وزیر آغا گروپ کا کہلواتے ہیں!۔ اور ایک دوسرے کے خلاف لکھتے بھی ہیں۔ جس کی مثال آپ کے گروپ کی جانب سے چھپنے والا اخبار ''آئینہ'' ہے، جو میرے پاس جدّہ تک پہنچتا ہے، جس میں وزیر آغا گروپ کے خلاف کیا کچھ نہیں لکھا جاتا!۔ قاسمی صاحب! میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آخر آپ دونوں دوستی کر کے، ہمارے لیے ایک مثال کیوں نہیں قائم کرتے اور ان دونوں گروپس کو پھر سے یکجا کیوں نہیں کر دیتے۔ آخر اس میں قباحت کیا ہے!''۔ زلفی صاحب نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''احمد ندیم قاسمی صاحب کا دوسرا مورچہ اُس وقت کُھلا جب اُن کا ایک بیان سامنے آیا کہ۔ کراچی میں تو کوئی اہم شاعر ہی نہیں، سوائے ایک کے اور وہ ہیں محشر بدایونی صاحب!۔ اور جب ہم تک یہ بات پہنچی تو ہمیں بیحد دکھ ہوا۔ لہٰذا کچھ دنوں بعد جب ہم لاہور گئے تو دوسرے دن جب ہم طفیل ہوشیار پوری صاحب کے پاس، ان کے ادبی رسالے ''محفل'' کے دفتر میں بیٹھے تھے تو، حفیظ تائبؔ صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے۔ ''بھئی اس وقت میں سب سے پہلے آپ کے پاس آ گیا ہوں، چونکہ مجھے معلوم ہے کہ کچھ دیر بعد ہی آپ دیگر لوگوں میں گھر جائیں گے''۔ ہم نے تائبؔ صاحب کی اس محبت کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ اچھا کیا آپ نے جو آ گئے۔ اب ذرا ہمیں ''فنون'' کے دفتر لے چلیں، وہاں قاسمی صاحب ہمارے منتظر ہیں۔ کہنے لگے ''بسم اللہ۔ نیچے میری موٹر سائیکل کھڑی ہے''۔ اس پر ہم ذرا ہچکچائے اور کہا۔ تائبؔ صاحب ٹیکسی سے چلتے ہیں۔ کہنے لگے۔ ''آپ ڈریں نہیں۔ میں آپ کو صحیح سلامت پہنچا دونگا''۔ خیر، آخر ہم قاسمیؔ صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ قاسمیؔ صاحب نہایت شفقت اور تپاک سے ملے۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو فرمایا۔ ''اور سنایئے کیا خبریں ہیں!''۔ ہم نے عرض کیا قاسمی صاحب ''نیوز میکر'' تو آپ ہیں، کراچی کے شاعروں کے حوالے سے آپ کا بیان سن کر حیرت اور دکھ ہوا۔ اسی کے اظہار کے لیے اِس وقت یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ بات ہم نے شکایتی لہجے میں کہی۔ جسے سن کر قاسمیؔ صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا۔ ''بھئی میں نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ ورنہ میں تو کراچی کے شاعروں کی بہت عزت کرتا ہوں، اور اپنے رسالے میں انہیں پنجاب کے شاعروں سے پہلے اور اہم جگہ پر چھاپتا ہوں۔

آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ ویسے بھی میں نے تو یہی کہا تھا کہ۔ کراچی کا کوئی اہم شاعر نہیں ہے۔ اور وہ اس لیے کہ وہاں تو کوئی۔ ملیح آبادی ہے، تو کوئی لکھنوی، کوئی امروہوی ہے، تو کوئی اکبرآبادی !!''۔ قاسمی صاحب کی اس بات پر ہم نے کہا۔ اگر یہی بات ہے تو۔ آپ کے ہاں بھی تو لاہور کا کوئی اہم شاعر نہیں۔ کہ کوئی جالندھری ہے، تو کوئی ہوشیار پوری، کوئی انبالوی ہے، کوئی لدھیانوی ہے تو کوئی بٹالوی۔ تو کیا آپ لاہور کے شاعروں کے لیے بھی یہی کہیں گے کہ لاہور میں کوئی اہم شاعر نہیں !''۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کا تیسرا مورچہ فیض احمد فیض کے خلاف تھا۔ جس کے حوالے سے ان کے بیانات اور تحریریں بالعموم سامنے آتی رہتی تھیں۔ جن پر اظہارِ خیال سے ہم گریز کرتے رہے۔ لیکن اتفاق سے، جب قاسمی صاحب پہلی بار ٹورانٹو تشریف لائے اور ہمارے شہر کے ایک معروف افسانہ نگار اور صحافی رحیم انجان صاحب نے قاسمی صاحب کو اپنے ہاں اپنے میگزین کے لیے ایک انٹرویو کے سلسلے میں مدعو کیا تو، ہمیں بھی بلالیا کہ ہم بھی قاسمی صاحب سے کچھ سوال کرلیں۔ بہرحال انٹرویو شروع ہوا۔ ویڈیو کیمرہ آن تھا۔ کہ صاحبِ خانہ نے قاسمی صاحب سے فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے سوال کیا۔ جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ۔ ''فیض صاحب کی شاعری میں فکر نہیں ہے!۔ البتہ بیانیہ شاعری کے لحاظ سے بڑی اہم ہے!''۔ لہٰذا اِس بار ہم خاموش نہ رہ سکے اور عرض کیا۔ قاسمی صاحب! آپ ہمیں یہ بتائیں کہ فکر سے خالی شاعری، شاعر کو اپنے ہم عصر شعراء میں سب سے زیادہ اہم اور توانا کیونکر بنا سکتی ہے!۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پاکستان کے کسی بھی شاعر کے کلام میں فکر نہیں۔ اور اگر ہے تو پھر دوسرے شعراء کی شاعری کو فیض سے بلند

مقام کیوں نہیں مِلا!؟۔

تسلیم الٰہی زلفی صاحب جو نہایت روانی کے ساتھ نابغۂ روزگار ہستیوں سے جڑی اپنی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ پہلو بدل کر گویا ہوئے: ''اور یہ یاد۔ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس دہلی کی ہے۔ جہاں ہمیں ''بہترین بین الاقوامی شاعر ۱۹۸۷ء'' کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ کم از کم ہماری زندگی کا وہ اس قدر اہم' یادگار اور تاریخی موقع تھا۔ جہاں دنیا بھر کے اکابرِ اردو ادب کا اجتماع تو تھا ہی۔ لیکن ان کی پزیرائی کے لیے برِ صغیر کے نابغۂ روزگار فنکاروں نے بھی خود کو فرشِ راہ کر دیا تھا۔ ان فنکاروں میں موسیقارِ اعظم نوشاعلی' یکتائے زمانہ غزل گائیک طلعت محمود' نامور نغمہ نگار مجروح سلطان پوری' عظیم اداکار دلیپ کمار' سائرہ بانو' نمی' سنیل دت اور نامور مصور فدا حسین وغیرہ نمایاں تھے۔ جلسہ گاہ میں تو ان تمام فنکاروں سے ظاہر ہے رسمی علیک سلیک اور مختصر بات چیت رہی۔ لیکن بھلا ہو آنجہانی سنیل دت کا کہ اگلے روز انہوں نے بشمول ہمارے' تمام مذکورہ فنکاروں کو اپنے گھر چائے پر بلایا۔ لہٰذا اُس موقع پر' ہمیں جہاں دیگر فنکاروں سے کم کم بات چیت کا موقع مِلا۔ وہاں نوشاد صاحب سے تا دیر گفت و شنید رہی۔ اور اُسی موقع پر جب ہم نے اس بات کا علم رکھتے ہوئے کہ نوشاد صاحب ایک نہایت طرحدار شاعر بھی ہیں' اُنہیں اپنا شعری مجموعہ ''دستاویز'' پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور ہمیں بازو سے پکڑ کر ایک کونے میں رکھے ہوئے مونڈھوں کی جانب لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ہماری کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ کسی کسی شعر پر مسکرائے' کسی پر گردن ہلائی اور کسی پر بے ساختہ واہ کہا۔ تقریباً پانچ منٹ تک وہ ہماری شاعری میں محو رہے۔ پھر کتاب کو بند کر کے' احتیاط کے ساتھ اپنے ہینڈ بیگ

میں رکھتے ہوئے' گویا ہوئے۔ زلفی صاحب! آپ کا شعری تعارف تو آپ کی کتاب سے ہو جائے گا' اب ذرا اپنی ''چکی کی مشقت'' کا کچھ حال سنایئے۔ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟۔ ہم نے عرض کیا' نوشآد صاحب! ہمارے لیے یہ لمحات نہایت اہم' تاریخی اور قیمتی ہیں۔ آپ جیسی نابغۂ روزگار ہستی سے ملاقات کا شاید پھر کبھی موقع ملے یا نہ ملے' لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ چند باتیں ہم آپ سے براہِ راست پوچھیں۔ ہماری اس خواہش کی شدت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے' نوشآد صاحب خفیف سا مسکرائے اور اور سرتاپا انکسار بن کر بولے۔ ''پوچھیئے کیا جاننا چاہتے ہیں اِس فقیر سے!'' نوشآد صاحب! سب سے پہلے تو ''دادا صاحب پھالکے ایوارڈ'' ملنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ ہماری یہ بات سن کر ایک بار پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن اِس بار کی مسکراہٹ معنی خیز تھی!! کہنے لگے۔ یہ پانچ سال پرانی بات آپ کو کیسے یاد آ گئی!۔ ہم نے عرض کیا' اصل میں ہم انتظار کر رہے تھے کہ جیسے ہی آپ کو ''پدما بھوشن'' ایوارڈ ملے تو' دونوں ایوارڈوں کی مبارک باد ایک ساتھ دیں۔ ہمارے اس جواب پر' اِس بار نوشاد صاحب باقاعدہ ہنسنے اور کہنے لگے۔ میاں! تو آپ کو پانچ سال اور انتظار کرنا ہوگا!!۔ ہم نے نوشآد صاحب کے کان کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا' کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی دوسرے موسیقار سے آپ کا ریکارڈ تڑوانے کا انتظار ہو!۔ جواب میں نوشآد صاحب نے بے ساختہ کہا۔ ''رموزِ مملکتِ خویش' خسرواں دانند''۔ اور جیسا کہ ہم سب نے دیکھا کہ واقعی پورے پانچ سال بعد یعنی ۱۹۹۲ء میں نوشآد صاحب کو ''پدما بھوشن ایوارڈ'' دیا گیا۔ نوشآد صاحب سے ہمارا اگلا سوال یہ تھا کہ آپ نے اپنے کام سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا!؟ اِس بار نوشآد صاحب کے چہرے پر

قدرے کرب کے آثار نمایاں تھے۔ کہنے لگے' بھائی میرے! یہی سوال آپ نے محمد رفیع صاحب یا طلعت محمود صاحب سے کیوں نہیں کیا۔ یقیناً میرا جواب ان کے جوابوں سے مختلف نہیں ہوگا۔ ہم نوشاؔد علی کو رنجیدہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے' لہٰذا اپنی جانس میں' سوال کو دوسرے زاویے سے دہرایا۔ تو کیا نئی نسل کے ''پوپ میوزک فیور'' نے مشرقی قدروں کو فراموش کر دیا ہے!؟ نوشاد صاحب نے نہایت تلخی سے جواب دیا۔ زلفی صاحب! یہ مٹھی بھر نئی نسل' آخر ہماری صدیوں پرانی کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی کو کیونکر رد کر سکتی ہے!!! ایسا نہیں ہے میرے بھائی!۔ اِس دور میں یہ سب سرمایہ کاروں کا کھیل ہے' جو کروڑوں روپیہ لگا کر اربوں کما رہے ہیں۔ موسیقارِ اعظم نوشاؔد علی سے ابھی ہم اتنی ہی باتیں کر پائے تھے کہ' مجروح سلطان پوری صاحب' ہم دونوں کو ایک کونے میں بیٹھا دیکھ کر' ہماری طرف بڑھے اور نوشاؔد صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ کیا کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ کیا ''نو سو پورے ہو گئے''۔ اور زلفی صاحب کے پاس عمرہ کرنے جانے کا ارادہ ہے!؟۔ خیر یہ تو دو بڑوں کا آپس کا مذاق تھا' لیکن مجروؔح صاحب کے اس مذاق سے ہماری وہ خفت دُور ہو گئی کہ۔ ہم نے اپنے سوالوں سے نوشاؔد صاحب کو قدرے رنجیدہ کر دیا تھا!''۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تسلیم الٰہی زلفی فنونِ لطیفہ کے نامور ادبی اسکالر ہیں۔ لہٰذا جب انہوں نے موسیقارِ اعظم نوشاد علی سے متعلق اپنی یادیں تازہ کیں تو ہمیں عظیم گلوکار محمد رفیع بھی شدت سے یاد آئے۔ اور ہم ویسے ہی زلفی صاحب سے پوچھ بیٹھے کہ اگر گلوکار محمد رفیع سے بھی ان کی کوئی یاد وابستہ ہے۔ تو انہوں نے بتایا: ''یہ ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے۔ مسلمانانِ عالم فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے میدانِ منیٰ کی خیمہ بستی میں مقیم' فجر کی نماز کے بعد اپنے اپنے

خیموں میں جائے نمازوں پر بیٹھے عبادٔ استغفار اور دعاؤں میں مشغول تھے۔ ان ہی لاکھوں حجاجِ کرام میں برِصغیر کے نامور فلمی گلوکار محمد رفیع بھی ہمارے خیمے کے ساتھ والے خیمے میں فجر کی نماز سے فارغ ہوکر نہایت خوش الحانی کے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ کسی بھی مقام پر محمد رفیع جیسی شخصیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی' لہٰذا یہ بات برِصغیر پاک و ہند کے تقریباً تمام حاجیوں کے علم میں تھی کہ ان کے ساتھ گلوکار محمد رفیع بھی حج کررہے ہیں۔ اس لیے تمام حج کے دوران ہر روز اور ہر وقت کوئی نہ کوئی ناپختہ ذہن حاجی' حج کی اہم عبادتوں اور دعاؤں کو فراموش کر کے' محمد رفیع کو دیکھنے' بات کرنے یا ہاتھ مِلانے چلا آتا!!۔ دورانِ حج لوگوں کے اس طرح مسلسل آنے جانے کی وجہ سے رفیع صاحب بہت پریشان تھے' لیکن اپنی سادہ طبیعت' منکسر المزاجی اور خوش اخلاقی کے سبب کسی کو اپنی حج اور عبادت کی ساعتوں میں مخل ہونے سے روک بھی نہیں پا رہے تھے۔ ہاں تو ہم بتا رہے تھے کہ محمد رفیع نہایت خوش الحانی سے تلاوت میں مصروف تھے۔ کہ اطراف کے خیموں سے کافی لوگ ان کے خیمے کے سامنے جمع ہوگئے اور ان کی تلاوت سنتے رہے۔ اُدھر محمد رفیع کچھ اس خشوع وخضوع کے ساتھ محوِ تلاوت تھے کہ انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ باہر ایک مجمع ان کی تلاوت سُن رہا ہے۔ بہرحال' اسی کیفیت میں کافی دن نکل آیا اور اجالا پھیلنے لگا' تب انہوں نے قرآن مجید بند کیا۔ تو باہر کھڑے ہوئے اکثر لوگ سبحان اللہ اور ماشاء اللہ کہتے ہوئے اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔ لیکن ان میں سے چند آدمی محمد رفیع کے خیمے میں داخل ہوگئے۔ اور ان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ اور ان کی گلوکاری اور مقبول عام گانوں کی تعریف کرنے لگے۔ پھر ایک صاحب نے بیحد اصرار کے ساتھ کوئی فلمی

نعت سنانے کی فرمائش کردی۔ جس پر ان کے ساتھیوں نے بھی۔ ''ہاں جی' ہاں جی رفیع صاحب آج تو کچھ ہو جائے'' کی رٹ لگادی!!۔ ہم تو خیر برابر کے خیمے سے یہ باتیں سن رہے تھے' لیکن اُن لمحات میں رفیع صاحب کی بے بسی کا ہمیں شدت سے اندازہ تھا۔ بہر حال' جب اُن لوگوں کا تقاضہ زبردستی کی حد تک شدت اختیار کر گیا تو سر جھکائے بیٹھے محمد رفیع نے گردن اٹھا کر اپنی اشک بھری آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھا اور نہایت عاجزی سے بولے۔ ''بھائیو! میں ایک گنہگار آدمی ہوں۔ اور آج اللہ نے اپنے کرم سے مجھے حج کی سعادت بخشی ہے۔ گناہوں سے توبہ کا موقع دیا ہے۔ اور آپ ایسے موقع پر مجھے گلوکاری کرنے کو کہہ رہے ہیں!!۔ مہربانی کر کے آپ اپنے اپنے خیموں میں جائیں۔ وہ عبادت کریں جس کا آج اللہ نے آپ کو موقع دیا ہے''۔ لیکن صاحب' وہ لوگ رفیع صاحب کی اس بات پر بجائے نادم اور شرمندہ ہونے کے' اُلٹے چراغ پا ہو گئے اور لڑنے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا' اور کہنے لگے۔ ''فلموں میں' جہاں گانا حرام ہے' وہاں تو آپ نعت گا لیتے ہیں۔ اور خوب لہک لہک کر بھجن بھی گا لیتے ہیں۔ لیکن یہاں مقدس زمین پر نعت گاتے ہوئے آپ کو خدا کا خوف آ رہا ہے''۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اس سے پہلے کہ بات اور بڑھ جاتی۔ ہم اپنے خیمے سے نکل کر محمد رفیع کے خیمے میں گئے اور بہ مشکل تمام' اُن بپھرے ہوئے لوگوں کو ٹھنڈا کر کے وہاں سے نکالا۔ اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر محمد رفیع بہت روئے۔ میں نے انہیں بہت تسلی دی۔ ٹھنڈا پانی پلایا۔ کافی دیر کے بعد ان کی طبیعت سنبھلی' تو انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور قرآن کھول کر محض ''زیرِ لب'' تلاوت شروع کر دی''۔ اس جذباتی واقعے کے بیان کے بعد زلفی صاحب نے ایک اور

قدرے سیاسی نوعیت کا واقعہ سنایا۔ جو ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے بتایا کہ:

"یہ وسط ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ اُس زمانے میں جدۃ کے ڈاؤن ٹاؤن میں شارع قابل پر واقع مرکزی بازار ہی بڑا شاپنگ سینٹر ہوا کرتا تھا۔ جہاں شام کے وقت بیشتر لوگ، اگر کوئی شاپنگ نہ بھی کرنی ہو تو محض چہل قدمی کے لیے ہی چلے جایا کرتے تھے۔ اُن دنوں وہاں مٹھی بھر پاکستانی اور ہندوستانی ہوا کرتے تھے۔ اوروں کی طرح ہم بھی ایک دن شارع قابل پر گھوم رہے تھے کہ ہم نے، یوگنڈا کے سابق صدر عیدی امین کو دیکھا۔ جو ایک اسٹور سے نکل رہے تھے۔ ہم قدم بڑھا کر ان کے قریب گئے اور سلام کے بعد مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے حیرت اور محتاط انداز میں گہری نظروں سے ہمیں دیکھا۔ اور وعلیکم السلام کہتے ہوئے مصافحہ کیا۔ ہم نے ان سے کہا۔ "آپ عیدی امین صاحب ہیں۔ ہم نے آپ کو پہچان لیا۔ اور اِس وقت یہاں عام بازار میں دیکھ کر حیران ہیں !!"۔ عیدی امین، اپنا محتاط اور قدرے "الرٹ" انداز برقرار رکھتے ہوئے سادگی سے مسکرائے اور بولے۔ "ہاں میں عیدی امین ہوں۔ اور اِس وقت ایک عام آدمی کی حیثیت میں یہاں شاپنگ کر رہا ہوں۔ لیکن آپ کی تعریف؟"۔ انہیں آمادۂ گفتگو پا کر۔ ہم نے مختصراً اپنا تعارف کرایا۔ پھر چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ اُس ملاقات کے دو ہفتے بعد ایک بار پھر وہ ہمیں اُسی بازار میں نظر آئے۔ اور ہم نے لپک کر انہیں جا لیا۔ اور جب مقابل ہو کر سلام کیا تو انہوں نے ہمیں پہچان لیا اور "وعلیکم السلام مسٹر زلفی!" کہہ کر مسکرائے۔ ہم نے پوچھا۔ شاپنگ ہو رہی ہے؟۔ وہ ہنس کر بولے۔

''یہاں قیدِ تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ جب بہت بور ہو جاتا ہوں' تو اِدہر کا رخ کرتا ہوں۔ کبھی ساحلِ سمندر کی جانب نکل جاتا ہوں''۔۔ہم نے کہا۔اگر ہم آپ کی اس تنہائی کو کسی حد تک کم کر سکیں تو یقیناً ہمیں خوشی ہوگی!۔یہ کہکر ہم نے اپنا کارڈ انہیں تھما دیا اور آگے بڑھ گئے۔اور پھر تیسرے روز شام کے وقت عیدی امین نے گھر پر ہمیں فون کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر ہم ان سے ملنے ان کے گھر آ سکتے ہیں۔لہٰذا ہم دوسرے دن ان سے ملنے گئے۔اور ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔یوگنڈا کے سیاسی اور سماجی حالات کے حوالے سے۔اُن عوامل کے حوالے سے جو عیدی امین کی حکومت کے خاتمے اور ان کے ملک بدر ہونے کا سبب بنے۔ان کے غلط قدامات۔اور اس کا کُھلے دل سے اعتراف اور آئندہ کے لائحہ عمل کے تعلق سے بھی۔اور اسی موقع پر پاکستان کے حوالے سے بھی بات چیت رہی۔اور انہوں نے اس ضمن میں ایک بڑے پتے کی بات کہی۔ وہ بات جو پاکستان میں فوجی حکمرانی کے ہر دور پر صادق آتی ہے!۔انہوں نے کہا:''جب سرحدوں کے محافظِ اعلیٰ' حکومت کے محافظ بھی بن جاتے ہیں تو۔اُس ملک کی سرحدیں غیر محفوظ ہو جاتی ہیں!''۔

زلفی صاحب سے اس سیر حاصل گفتگو کے دوران ہمیں یاد آیا کہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی منفرد مزاح گو شاعر سیّد ضمیر جعفری صاحب سے بھی بہت قربت رہی ہے۔اور جعفری صاحب ''نوائے وقت'' میں شائع ہونے والے اپنے کالم ''نظر غبارے'' میں کسی نہ کسی حوالے سے اکثر زلفی صاحب کا ذکر کیا کرتے تھے۔لہٰذا اب ہم نے زلفی صاحب سے سیّد ضمیر جعفری صاحب کے حوالے کوئی خاص یاد تازہ کرنے کی درخوست کی۔تو انہوں نے بتایا:

''سیّد ضمیر جعفری صاحب کا خیال آتے ہی ایک شفقت بھرا اور مسکراہٹ سے آراستہ چہرہ پردۂ ذہن پر ابھر آتا ہے۔ جن لوگوں کو ان کا قرب حاصل رہا ہے' وہ جانتے ہیں کہ جعفری صاحب پر ہمیشہ ایک سرمستی اور بے خودی کی سی کیفیت طاری رہتی تھے۔ خاص کر جب وہ شعر موزوں کرتے تو ٹہلنے لگتے اور اور اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ گنگنانا شروع کر دیتے تھے۔ اُن کے اس اندازِ فکرِ سخن کا علم ہمیں ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ جب وہ جدّہ میں ہمارے مہمان ہوئے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ اُن دنوں اسکولوں میں موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں۔ لہٰذا ہماری فیملی پاکستان گئی ہوئی تھی۔ کہ جعفری صاحب کا ٹیلی گرام مِلا کہ میں اپنی بیگم کے ساتھ جدّہ آ رہا ہوں۔ اور آپ ہی کے پاس ٹھہروں گا۔ لہٰذا اپنی شاعر برادری کو اطلاع دیدیں۔ تار پاکر تو گویا ہماری عید ہوگئی۔ کہ فیملی کی غیر موجودگی میں اکیلے ایک ماہ گزارنا' ہمارے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ خیر تیسرے دن جعفری صاحب اور ان کی بیگم جہاں آراء جعفری صاحبہ تشریف لے آئے۔ لہٰذا پہلے تو ہم انہیں عمرہ کروانے مکۃ المکرّمہ لے گئے۔ اس کے بعد اُسی ویک اینڈ پر ان کے اعزاز میں مشاعرے کا اعلان کر دیا۔ ادھر مشاعرے والے دن ہی تبوک سے جعفری صاحب کا بیٹا اور بہو بھی انہیں لینے جدّہ آ گئے۔ خیر اُس وقت تو جعفری صاحب کچھ نہ بولے' لیکن جب مشاعرہ ہو گیا اور دوسرے دن اُن کے بیٹے نے کہا کہ اب تبوک چلیں' تو جعفری صاحب نے اعلان کر دیا کہ۔ ''تم اپنی ماں کو لے جاؤ' میں بعد میں آ جاؤں گا' ابھی مجھے کچھ دن زلفی صاحب کے پاس رہنا ہے''۔ اس طرح وہ ہمارے ساتھ دو ہفتے رہے۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ہم تو صبح سات بجے جدّہ ائرپورٹ اپنے آفس چلے جاتے اور سہ پہر تین بجے واپس لوٹتے۔ ادھر جعفری

صاحب سارا دن ہماری ''اسٹڈی'' میں گھسے اپنی پسند کی کتابیں پڑھتے رہتے۔ اور شام کو جب ہم گھر آتے تو، جعفری صاحب کو کوئی کتاب ہاتھ میں لیے محوِ مطالعہ یا گھر میں ٹہلتے اور گنگناتے ہوئے شعر موزوں کرتا پاتے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی نعرہ لگاتے۔ ''آیئے زلفی صاحب!۔ بھئی آپ کے پاس کتابوں کا Collection اتنا اچھا ہے کہ جی کرتا ہے کہ اپنی باقی زندگی آپ ہی کے پاس گزار دوں''۔ اپنے جاب سے ہمارے گھر آنے کے بعد جعفری صاحب سے مختلف موضوعات پر باتوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا تو رات ہو جاتی، اور ہر روز ہی کسی نہ کسی حوالے سے ہم دونوں میں بحث چھڑ جاتی۔ اُس موقع پر جعفری صاحب کی علمیت اپنے جوہر دکھاتی، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر کسی نہ کسی بات پر اُن سے اختلاف کر بیٹھتے تاکہ اُن کے مطالعے اور تجربات سے مستفید ہو سکیں۔ اسی حوالے سے دنیا بھر کے اہلِ ادب بالعموم اور پاکستان کے اہلِ قلم بالخصوص، سیّد ضمیر جعفری کا ''نوائے وقت'' میں چھپنے والا مستقل کالم ''نظر غبارے'' کبھی نہیں بھلا سکیں گے، جس میں انہوں نے مسلسل جدّہ میں ہمارے درمیان ہونے والی علمی ادبی بحث و تکرار کو اپنے مخصوص انداز میں موضوع بنایا۔ ہمارے پاس جعفری صاحب کے قیام کے دوران ہم نے بار بار فرمائش کر کر کے ان کی پرانی اور مشہور و مقبول ترین نظمیں سنیں۔ جو وہ اپنی پرانی بیاض سے سنایا کرتے تھے۔ اسی موقع پر ایک مرتبہ وہ بیاض سے اپنی مشہور نظم ''پیدا کرو'' سنا رہے تھے کہ درمیان میں تبوک سے ان کے بیٹے کا فون آ گیا۔ ملازم نے فون انہیں لا کر دیا تو انہوں نے اپنی بیاض ہمارے ہاتھ میں تھما کر، بیٹے سے بات شروع کر دی۔ اس دوران ہم نے اُس نظم کو مکمل کرنے کے خیال سے، خود ہی اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

اور جب آخری شعر پر پہنچے تو اس کے مصرعۂ اولیٰ کو ان کے مشہور مطبوعہ مصرعے سے مختلف پایا!! آپ کو بھی یاد ہوگا' سیّد ضمیر جعفری کا یہ مشہور شعر کہ۔

حضرتِ اقبالؔ کا شاہیں تو ہم سے اُڑ گیا
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو!

لیکن اُن کی پرانی بیاض میں یہ شعر کچھ یوں لکھا تھا۔

کب تلک پنجاب سے منگواؤ گے چوپائے تم
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

لہٰذا ہم نے جعفری صاحب سے پوچھا کہ یہ مصرعہ آپ نے کب اور کیوں تبدیل کیا؟۔ ہمارے اس استفسار پر جعفری صاحب پہلے تو دیر تک ہنستے رہے۔ پھر بتایا کہ دراصل یہ نظم میں نے خصوصی طور پر' کراچی میں ہونے والے ایک کل پاکستان مشاعرے کے لیے کہی تھی۔ اُس زمانے میں' کراچی میں مویشیوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بیشتر چوپائے پنجاب سے منگوائے جاتے تھے۔ لہٰذا میں نے ازراہِ مذاق یہی بات اپنے اس شعر میں کہی تھے کہ۔

کب تلک پنجاب سے منگواؤ گے چوپائے تم
اب کوئی اپنا مقامی جانور پیدا کرو

لیکن مشاعرے سے ایک دن پہلے میں ابنِ انشاء کے پاس بیٹھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ آپ کے کراچی کے مشاعرے کے لیے میں نے خاص نظم کہی ہے۔ تو انہوں نے فرمائش کی کہ ہم تو ابھی سنیں گے۔ لہٰذا ہم نے یہ نظم سنائی تو آخری شعر کا مصرعۂ اولیٰ سُن کر انہوں نے کہا کہ۔ کراچی والوں کے لیے یہ مصرعہ ذو معنی ہے!۔

لہٰذا مناسب ہوگا کہ آپ اسے تبدیل کر دیں۔ اس طرح میں نے یہ مصرعہ تبدیل کیا۔ اور تبدیل شدہ مصرعے والے شعر نے ملک گیر شہرت حاصل کی"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی شخصیت اور عملی روّیوں کے حوالے سے بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایک زمانے میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی ان سے بہت ملاقاتیں رہی ہیں۔ لہٰذا اِس وقت ہم نے ضروری سمجھا کہ زلفی صاحب سے حضرتِ جوشؔ کے حوالے سے بھی کچھ یادیں تازہ کی جائیں۔ اور ہمارے استفسار پر انہوں نے بتایا: "یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ ہم عید منانے کے لیے اپنی فیملی کے ساتھ' حسب معمول پاکستان گئے ہوئے تھے۔ عید کے دن نماز وغیرہ سے فارغ ہوکر' حسب دستور جب ہم نے اپنے احباب سے ملنے کا پروگرام بنایا تو یکا یک دل میں آئی کہ کیوں نہ اِس مرتبہ عید کے دن کی کچھ گھڑیاں جوشؔ صاحب کے ساتھ گزاری جائیں۔ ویسے تو بارہا جوشؔ صاحب کے دیوان خانے کی محفلوں میں شریک ہو چکے تھے' لیکن اب جوشؔ صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں مسلسل بیمار رہنے کے باعث بڑی حد تک کمزور اور قدرے چڑچڑے سے ہوگئے تھے۔ اس لیے اب' ان کے دیوان خانے میں ہر شام کی عمومی اور "ویک اینڈ" کی خصوصی سجنے والی محافل کا پہلے جیسا رنگ اور شور نہیں رہا تھا۔ بہرحال' جوشؔ صاحب کا خیال آتے ہی ہم نے گھر سے نکلنے سے پہلے راغبؔ مرادآبادی صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ اگر وہ بھی' ابھی جوشؔ صاحب کی طرف نکلنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو ہم انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھی وہاں جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ لہٰذا ہم انہیں لیتے ہوئے پہلے میٹرپول ہوٹل گئے' جہاں

سے ہم نے جوشؔ صاحب کے لیے عید کا ''تحفہ'' خریدا اور وہاں سے سیدھے پاپوش نگر کی راہ لی۔ جوشؔ صاحب کے دروازے پر دستک دینے سے پہلے ہی ایکدم دروازہ کھلا اور اندر سے سیڑھیاں اترتے محشؔر بدایونی صاحب برآمد ہوئے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ''آپ لوگوں نے اچھا کیا جو آ گئے۔ جوشؔ صاحب آج بہت ہشاش بشاش اور بڑے موڈ میں ہیں''۔ اور واقعی اُس روز جوشؔ صاحب بڑی حد تک رو بہ صحت اور خوش تھے۔ ہم تقریباً ایک سال کے غیاب کے بعد اُن سے ملنے گئے تھے۔ لہٰذا وہ ہم سے بڑی گرم جوشی سے ملے' اور کافی دیر تک خیر' خیریت دریافت کرتے رہے۔ سعودی عرب کے بارے میں کافی پوچھ گچھ کی۔ اور جب ہم نے ان سے اُن کی گرتی ہوئی صحت اور مستقل علالت پر دکھ اور تشویش کا اظہار کیا تو کہنے لگے۔ ''زلفی میاں! بس اب تو ہمارا چل چلاؤ ہے''۔ ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔ جوشؔ صاحب! آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ فرمانے لگے۔ ''بھئی کلِ نفس ذائقة الموت۔ مگر ہمیں یہ معلوم ہے کہ' ہم تو خیر چلے جائیں گے۔ لیکن ہمارا کلام رہتی دنیا تک سلطنتِ شاعری پر حکمرانی کرے گا''۔ اور جس دم جوشؔ صاحب یہ بات کہہ رہے تھے' ہم نے دیکھا کہ ان کے سرخ و سفید چہرے پہ ایک خاص چمک تھی' لہجے میں وہی تمکنت اور شکوہ تھا۔ پھر دھیمے لہجے میں فرمایا۔ ''اور بھئی اب تو آپ کے ٹیلی وژن والے بھی ہمارے چل چلاؤ کو دیکھتے ہوئے' ہماری فلم بندی کر کے لے گئے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے کہہ دیا ہے کہ جو باتیں ہم نے کیں ہیں' اور ان کے سوالوں کے جو' جواب دیئے ہیں' وہ ہمارے مرنے کے بعد نشر کریں۔ ورنہ کچھ منافقوں کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی صورتِ

حال کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے"۔ جوش صاحب کے اس بیان پر ہم نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔ جوش صاحب! ٹی وی کے لیے اپنے انٹرویو میں آخر آپ نے ایسی کیا باتیں کہہ دی ہیں جن کے ٹیلی کاسٹ ہونے پت کچھ لوگ ہنگامہ کھڑا کر دیں گے !!۔ ہمارے استفسار اور تجسس پر جوش صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے گویا ہوئے۔ "بھئی بات یہ ہے کہ ہم نے تو ٹیلی وژن والوں کو بھی ہماری زندگی میں ہمارا انٹرویو نشر کرنے سے منع کر دیا ہے۔تو پھر ہم آپ کو کیسے بتا سکتے ہیں۔ البتہ اپنی ایک رباعی ضرور آپ کو سنا دیتے ہیں۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں:

بے چارہ عداوت میں گھلا جاتا ہے
وہ آگ لگی ہے کہ پھنکا جاتا ہے
جب تک کہ میں زندہ ہوں اسے چین نہیں
یہ سوچ کے دشمن پہ ترس آتا ہے

۱۹۸۶ء میں ہم نے پاکستان کے کئی ایک ادبی پرچوں میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کا ایک ادبی کالم "جب احمد فراز نے اپنا عمرہ توڑا" پڑھا تھا جو ان رسالوں نے روزنامہ جنگ کراچی سے Lift کیا تھا۔ آج جہاں زلفی صاحب سے ان کی ذات سے تعلق رکھنے والی دنیا بھر کی باتیں ہم نے معلوم کیں اور سنیں۔ وہاں ہم نے احمد فراز صاحب کے عمرہ توڑنے والا واقعہ بھی سنانے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے بتایا: "مارچ ۱۹۸۶ء میں جب اظہر عباس ہاشمی پاکستان سے شاعر لکھنوی محسن بھوپالی منظر ایوبی اور عاشق کیرانوی وغیرہ کو عمرہ کروانے جدۃ لے آئے۔ اور ان سب کا قیام ہمارے گھر ہی میں رہا۔ تو حسب دستور ہم نے ان کے اعزاز میں مشاعرے کا اعلان

کردیا۔ مشاعرے سے چار روز پہلے شام کے وقت یکا یک دبئی سے سلیم جعفری کا فون آیا کہ۔ ''فرازؔ صاحب کل ''عمرہ'' کرنے کے لیے جدہ پہنچ رہے ہیں' لہٰذا آپ اپنے مشاعرے میں ان کے نام کا اعلان بھی کردیں''۔ یہ خبر ملنے پر ہم اپنی ''حیرت'' بھری خوشی کا اظہار کرنا ہی چاہتے تھے کہ۔ فرازؔ صاحب نے سلیم جعفری کے ہاتھ سے فون لے لیا اور خمار بھری آواز میں بولے۔ ''ارے بھئی زلفی!۔ دیکھیں ہم وہاں صرف عمرہ کی غرض سے آرہے ہیں۔ لہٰذا آپ ان فضولیات میں ہمیں نہ ڈالیں۔ ہمیں تو بس عمرہ کرنا ہے۔ اور وہاں آپ چند دوستوں سے ملاقات کرنی ہے''۔ فون ایک بار پھر سلیم جعفری نے لے لیا اور کہا۔ ''نہیں زلفی آپ فرازؔ صاحب کے نام کا اعلان کریں۔ میں کل انہیں روانہ کر رہا ہوں''۔ بہرحال دوسرے دن احمد فراز جدہ پہنچ گئے۔ قصہ مختصر' اُدھر فرازؔ صاحب عمرہ کرکے واپس آئے' اِدھر ہم نے مشاعرے کے انتظامات مکمل کرلیے تھے۔ اُسی شام اور حسبِ روایت مشاعرے سے پہلے ہمارے گھر پر تمام مہمانوں اور مقامی شعراء کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ اس موقع پر ہمارے اور فرازؔ صاحب کے مشترکہ پشاوری دوست حسن علی کا فون آیا کہ۔ ''فرازؔ صاحب کو ڈنر ہم اپنے گھر کروانا چاہتے ہیں' اور ڈنر کے بعد ہم انہیں ڈائریکٹ مشاعرہ گاہ میں لے آئیں گے''۔ لہٰذا ہم بھی عشایئے کے بعد اپنے مہمان شعراء کو لے کر مشاعرہ گاہ پہنچے۔ اسٹیج پر فرشی نشست تھی' اور تمام مہمان شعراء تشریف فرما۔ حضرت شاعرؔ لکھنوی کی صدارت میں ہونے والے اس مشاعرے کا ناظم ہونے کے ناتے' ہم نے اپنی غزل سے آغاز کیا۔ اور جب اِس شعر پر پہنچے کہ۔

میں اپنے سر کو چھپاؤں' تو پاؤں کُھلتے ہیں
دیاء منڈیر پہ رکھوں' تو گھر اندھیرا ہے

توفرازؔ صاحب۔ ''بھئی واہ زلفی۔ پھر پڑھیں''۔ کہتے ہوئے' برابر میں بیٹھے ہوئے شاعرؔ لکھنوی صاحب پر تقریباً لڑھک گئے۔ محسن بھوپالی صاحب نے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جلدی سے بڑھ کر احمد فرازؔ کو سیدھا بٹھایا۔ اور پھر پلٹ کر ہمارے کان میں کہا۔ ''زلفی! فرازؔ کا عمرہ ٹوٹ گیا۔!!''۔

تسلیم الٰہی زلفی صاحب نے جیسے ہی اپنی بات مکمل کی۔ ہماری نظر ان کے کتب خانے میں لگی درجنوں یادگاری' تاریخی اور نادر تصاویر میں سے علی سردار جعفری صاحب کی اُس تصویر پر ٹھہر گئی جو عالمی اردو کانفرنس دہلی کی ہے' اور جس میں بالترتیب: علی سردار جعفری کے ساتھ تسلیم الٰہی زلفی' مالک رام اور افتخار عارف اسٹیج پر تشریف فرما ہیں۔ لہٰذا ہم نے اُس تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زلفی صاحب سے عرض کیا۔ سر! کچھ اس تصویر سے متعلق یادیں بھی ہمارے ساتھ شیئر کیجئے۔ تو انہوں نے بتایا: ''یہ ۱۹۸۰ء کے اوائل کی بات ہے' اُس وقت تک علی سردار جعفری صاحب اور مالک رام صاحب سے ہماری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی خط و کتابت تھی۔ البتہ ادبی رسالوں کے توسط سے ان لوگوں تک ہماری قلمی کاوشیں پہنچتی رہتی تھیں۔ کہ ہمیں پہلی ''عالمی اردو کانفرنس دہلی'' میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ لہٰذا ہم مقررہ تاریخ کو جدہ سے دہلی پہنچ گئے۔ وہ کانفرنس تو گویا دنیا بھر کے مشاہیر کا اجتماع تھا۔ اور اُس موقع پر پہلی بار علی سردار جعفری صاحب اور مالک رام صاحب سے ہماری بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ دونوں ہی ہستیوں نے ہمیں نہایت محبت اور اپنایت سے گلے لگایا اور فرمایا کہ ہم لوگ گزشتہ ایک دھائی سے آپ کی شاعری اور تنقیدی مضامین پڑھتے آئے ہیں۔ اور آج آپ سے مِل کر بیحد خوشی ہوئی ہے۔ اب اُس سہ روزہ کانفرنس

کی گہما گہمی میں تو ہم لوگوں کو زیادہ بات چیت کا موقع نہیں ملا۔ البتہ چوتھے روز ہمارے اعزاز میں ''غالب اکیڈمی دہلی'' کی تقریبِ پزیرائی میں۔ ان دونوں شخصیات نے مائک پر آ کر ہمارے حوالے سے اس محبت سے اظہارِ خیال فرمایا کہ ہمارا سر جھک گیا۔علی سردار جعفری صاحب نے فرمایا۔ ''تسلیم الٰہی زلفی صاحب کا کلام میں عرصۂ دراز سے پاکستان اور ھندوستان کے ہر ادبی پرچے میں پڑھتا آ رہا ہوں۔ ان کی شاعری کے ابتدائی دور پر رومانوی رنگ حاوی ہے۔ جو یقیناً ان کی نوعمری کی دین تھی۔ لیکن اب گذشتہ پندرہ سولہ سال سے میں اِن کی شاعری میں احتجاجی اور مزاحمتی رنگ بہت نمایاں دیکھ رہا ہوں۔ جو ظاہر ہے ان کے وطن کی سیاسی اور استحصالی قوتوں کے خلاف رّدِعمل ہے۔اس ضمن میں زلفی صاحب کی شاعری کے حوالے سے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ان کی احتجاجی اور مزاحمتی شاعری میں پھکڑ پن یا جھنجھلاہٹ ہر گز نہیں' بلکہ جدید روایتی غزل کی چاشنی اور زبان کی شائستگی ہے جو ان کی فکر اور مزاج کی دین ہے''۔ اسی طرح مالک رام صاحب نے پوڈیم پر آ کر فرمایا: ''غالب اکیڈمی والوں نے اپنے دعوت نامے میں لکھا تھا کہ جدۃ سعودی عرب سے تشریف لانے والے مہمان شاعر اور ادیب جناب تسلیم الٰہی زلفی کی تقریبِ پزیرائی میں مجھے بھی خطاب کرنا ہے۔ لہٰذا میں نے :شب خون' شاعر' فنون' اوراق' نیرنگِ خیال' افکار اور ادبِ لطیف وغیرہ کے پرانے شمارے کھنگالے کہ زلفی صاحب کے رشحاتِ قلم پر اظہارِ خیال والی نظر ڈالوں۔اور اسی دوران اِن کے لکھے ہوئے کئی تنقیدی مضامین بھی نظر سے گزرے' جنہیں پڑھ کر میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں زلفی صاحب کی شاعری پر اظہارِ خیال کروں یا ان کی نثر

نگاری پر۔ کہ یہ ہر دو جہات کے شہسوار ہیں۔ لیکن ابھی جب انہوں نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں، تو میرا مسئلہ خود بہ خود حل ہوگیا۔ کہ اب مجھے ان کی شاعری پر بات کرنی ہے۔ تو یوں ہے کہ تسلیم الٰہی زلفی کی شاعری میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے، فکر میں گہرائی اور ذہنِ رسا کی وسعت ہے، یہ لفظوں کا انتخاب اور استعمال بڑی احتیاط سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر اور سن کر مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہورہی کہ بلا مبالغہ ان کی شاعری اِس عہد کی جدید کے رنگ و آہنگ میں رچی بسی ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی کہتا رہا ہوں کہ پاکستان میں نئی نسل کے شعراء بڑے خوبصورت شعر کہہ رہے ہیں۔ جو بلاشبہ برِ صغیر کی نمائندہ شاعری ہے۔ اور آج یہاں اِس وقت زلفی صاحب اسی جدید تر نمائندہ شاعری کی نمائندگی فرما رہے ہیں''۔ دہلی میں پہلی ملاقات کے بعد علی سردار جعفری صاب سے تقریباً ہر سال ہی انڈیا کے علاوہ شمالی امریکہ اور یورپ وغیرہ میں منعقد ہونے والے مشاعرے؛ اور کانفرنسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جبکہ آخری مرتبہ کا ساتھ شمالی امریکہ کے سن ۱۹۸ء میں ہونے والے Chain مشاعروں میں رہا۔ جس میں بیشتر دفعہ ہم لوگوں کو ایک ہی جگہ ٹھہرایا گیا۔ ان بین الاقوامی مشاعروں میں ظاہر ہے سردار بھائی تو انڈیا سے آئے تھے۔ جبکہ ہم سعودی عربیہ سے۔ جمیل الدین عالیؔ، پروین شاکر اور امجد اسلام امجد پاکستان سے اور افتخار عارف لندن انگلینڈ سے۔ سردار جعفری صاحب کے ساتھ گزارا ہوا وہ آخری وقت ہے جو تقریباً ایک ماہ پر محیط رہا۔ مانٹریال میں غالباً وہاں کی ''بزمِ ادب'' والوں کا مشاعرہ تھا۔ لہٰذا ہمارے قافلے کو مانٹریال لے جایا گیا' جہاں ہم لوگوں کے قیام کا انتظام مختلف جگہوں پر کیا گیا۔ لیکن اِس مرتبہ بھی سردار بھائی کے ساتھ مجھے، پروین شاکر اور افتخار عارف کو

ٹھہرایا گیا۔ ان کی علمی اور فکری گفتگو سے ہم سب کو بیحد مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ علی سردار جعفری مزاجاً بیحد حسن پرست تھے لیکن نسوانیت کی جانب ان کا روّیہ تحفظ آمیز احترام کا سا ہوتا تھا۔ لہٰذا اسی حوالے سے ان کی ایک عادت تھی کہ محفل میں جہاں کہیں انہوں نے دو خوبصورت عورتوں کو ایک ساتھ بیٹھا دیکھا۔ فوراً ''کیا میں دو خوبصورت خواتین کے درمیان بیٹھ سکتا ہوں'' کہہ کر ان کے درمیان بیٹھ جایا کرتے تھے۔ الغرض علی سردار جعفری صاحب کی دل آویز شخصیت کے حوالے سے اتنی ساری باتیں ہیں کہ جنہیں بیان کرنے بیٹھیں تو کئی کتابیں مرتب ہو جائیں''۔

اردو ادب کی تاریخ کا حصہ بننے والی تسلیم الٰہی زلفی کی اہم یادیں ایک کے بعد ایک ہم پر منکشف ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ہم نے مولانا ماہر القادری کے یکا یک انتقال کے بارے میں ان سے معلوم کیا۔ کہ زلفی صاحب کے ہاتھوں میں انہوں نے دم توڑا تھا۔ اُس سانحے کو یاد کر کے وہ بیحد دکھ سے بولے: ''یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ سفارت خانۂ پاکستان جدۃ کے تعاون سے ہم نے ایک بین الاقوامی مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان سے: حفیظ جالندھری، احسان دانش، مولانا ماہر القادری، سرور بارہ بنکوی، وحیدہ نسیم اور اُس دور کے کئی نامور شعراء تشریف لائے تھے۔ جن کے نام اِس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ خیر، سعودی عرب میں جلسے، جلوس اور اجتماعات پر پابندی کے سبب، مشاعرے کا انعقاد پاکستانی سفارت خانے کی عمارت کے احاطے میں کیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تمام سفارت خانے ابھی سعودی دارالحکومت ریاض منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اور پاکستانی سفارت خانہ جدۃ ٹیلی وژن اسٹیشن کے مقابل ایک بڑی عمارت میں واقع تھا۔ مشاعرے

والے دن سے دو روز قبل ہی تمام شعراء کرام جدۃ تشریف لے آئے تھے اور عمرہ و زیارتِ مدینۃ المنورہ وغیرہ کر چکے تھے۔ لہٰذا ہر شام جدۃ کے تمام شاعر' اہل علم اور اہلِ ذوق حضرات اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر' ان مہمان شعراء کے پاس ہمارے گھر جمع ہو جاتے اور ان جہاں دیدہ اور نابغۂ روزگار ہستیوں کی علمی' ادبی اور سماجی گفتگو' چٹکلوں' آپس کی نوک جھوک اور جملے بازی سے محظوظ ہوتے۔ اُس موقع پر خاص کر حفیظ جالندھری صاحب اور مولانا ماہر القادری صاحب کی نوک جھوک اور جملے بازی بہت مزا دیتی تھی۔ حفیظ جالندھری میں ''شاہنامہ اسلام'' کا خالق ہونے کے باوجود مولویوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ ''شاہ نامۂ اسلام'' کو توشۂ آخرت اور اپنی مغفرت کا سامان کہتے تھے۔ جبکہ مولانا ماہر القادری عاشقِ رسول ﷺ اور متقی و پرہیزگار آدمی۔ البتہ مرغن کھانوں اور مرغِ مسلّم کے رسیا تھے۔ لہٰذا حفیظ صاحب' ماہر صاحب کو ''مولوی مرغِ مسلّم'' کہہ کر اُن سے مذاق کیا کرتے تھے۔ بہرحال اسی طرح خوبصورت اور یادگار شاموں کے بعد۔ آخر مشاعرے کی شب بھی آ گئی۔ مشاعرہ گاہ میں اسٹیج پر فرشی نشست تھی۔ جس پر خوبصورت قالین بچھے اور گاؤ تکیئے رکھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ اور حسب دستور پہلے ہم مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ جس کے بعد مہمان شعراء نے اپنا وہ مشہورِ زمانہ کلام' جو سرمایۂ اردو شاعری ہے' سنا کر سماں باندھ دیا۔ اور تب ہی وہ گھڑی بھی آ پہنچی۔ جب مولانا ماہر القادری ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ مائک پر حفیظ جالندھری صاحب کھڑے اپنی مخصوص حرکات و سکنات اور ترنم کے ساتھ غزل سنا رہے تھے۔ جب وہ اِس شعر پر پہنچے تو مولانا ماہر القادری صاحب کی طرف رخ کر کے فرمایا۔

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسائے

جس کے جواب میں مولانا کب چوکنے والے تھے۔ لہٰذا لپک کر مائک کی طرف جانا چاہا کہ۔ اچانک ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ اور وہ وہیں سینہ تھام کر گر گئے۔ میں نے انہیں سہارا دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی''۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ مولانا ماہرالقادری صاحب کے ہارٹ فیل والی یاد نے زلفی صاحب کو رنجیدہ کردیا ہے۔ لہٰذا ہم نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے ان سے اکابرِ ادب کی کسی خوشگوار یاد کو تازہ کرنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے بتایا: ''یہ ۱۹۷۰ء کے اواخر کی بات ہے کہ ''انجمن ترقی اردو دہلی'' نے اردو کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا' ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر انور سدید مدعو تھے' لندن سے عاشور کاظمی تشریف لائے تھے' جبکہ سعودی عرب سے ہمیں بلایا گیا تھا۔ ہم لوگ چونکہ مقررہ دن سے ایک روز پہلے دہلی پہنچ گئے تھے' لہٰذا انجمن کے سربراہ ڈاکٹر خلیق انجم نے ''انجمن'' کے دفتر میں مقامی اہلِ علم وقلم سے ہم مہمانوں کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ اور یہ دلچسپ صورتِ حال اسی محفل میں اُس وقت پیدا ہوئی جب جمیل جالبی صاحب نے کسی بات پر ہمارا نام لے کر ہمیں مخاطب کیا۔ تو وزیر آغا صاحب نے (جو ہمیں دہلی کا کوئی مقامی شاعر سمجھ رہے تھے) چونک کر دیکھا۔ اور حیرت سے گویا ہوئے۔ ''ارے آپ تسلیم الٰہی زلفی ہیں!!''۔ اب ہم تو چونکہ اُن سے واقف تھے' لیکن اب تک انہیں' نہیں بتایا تھا کہ ہم کون ہیں۔ کہ انہیں اس کیفیت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اب عرض کیا کہ۔ ''جی! اب تک تو ہم ہی تسلیم الٰہی زلفی ہیں''۔

جس پر وہ تیزی سے اٹھے اور بڑھ کر ہمیں گلے لگایا۔ اور سب کو بتانے لگے۔ ''بھئی کمال ہوگیا۔ زلفی صاحب عرصۂ دراز سے میرے رسالے ''اوراق'' میں چھپ رہے ہیں۔ اور میں تو سمجھتا تھا کہ یہ کوئی بڑی عمر کے پختہ کار جدید شاعر ہیں' جو سرزمینِ حجاز سے میرے پرچے کے لیے اپنا کلام بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ تو تیس بتّیس سال کے نوجوان نکلے !!''۔ اور پھر ہنس کر ہم سے کہنے لگے۔ ''ارے میاں! اب تو میں آپ کا کلام نئی نسل کے شعراء کے حصے میں شائع کروں گا''۔

عرصۂ قیامِ سعودی عرب کے دوران تسلیم الٰہی زلفی صاحب جب اپنے عالمی دوروں' اہم علمی' ادبی کانفرنسوں' سیمناروں' مشاعروں اور اجتماعات میں شرکت اور عالمی مشاہیر سے صحبتوں اور ربط و تعلقات کی یادیں تازہ کر چکے تو ہم نے اُسی زمانے کے تناظر میں ان کی NASA پلانیٹری ریسرچ سینٹر USA سے وابستگی کے حوالے سے دریافت کیا' تو انہوں نے فرمایا: ''یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ NASA پلانیٹری ریسرچ سینٹر USA نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اور بتایا کہ۔ ''ہم اپنے پلانیٹری تحقیقی ادارے کی رپورٹیں گاہے بہ گاہے شائع بھی کرتے ہیں۔ جو دنیا بھر کے پلانیٹری ریسرچ کے اداروں اور رسدگاہوں کو بھیجی جاتی ہیں۔ لیکن اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تحقیقی رپورٹیں ہم اپنی نگرانی میں ہر ملک کی قومی زبان میں ترجمہ کروا کے بھیجیں گے۔ لہٰذا اس ضمن میں عربی اور اردو ترجمے کے لیے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے''۔ اب یہ معاملہ چونکہ ہماری دلچسپی اور زبان دانی کا تھا' لہٰذا ہم نے بخوشی یہ کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس طرح ہمیں اس ادارے کی تاحیات رکنیت بھی مل گئی''۔

سعودی عربیہ میں عرصۂ دراز تک اردو شعر و ادب اور تہذیب کی ترویج و بقاء

کے لیے سرگرمِ عمل رہنے کے بعد یہ ذمّہ داری زلفی صاحب نے اپنے ساتھی اہلِ ادب کو سونپی۔ اور اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کینیڈا ہجرت کی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کینیڈا آنے کے بعد بھی تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی وہی پیشہ ورانہ اور علمی، ادبی، تخلیقی، اشاعتی اور اجتماعی سرگرمیاں اور زیادہ وسائل کے ساتھ جاری وساری ہیں۔ لہٰذا ہم نے جب زلفی صاحب سے کہا کہ۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ ۱۹۷۰ء کے اوائل سے آپ اپنی منصبی ذمّہ داریوں کی بجا آوری کے لیے دنیا بھر میں جاتے آتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ کینیڈا آپ پہلی بار کب تشریف لائے تھے۔ اور اُس وقت یہاں برِ صغیر کے لوگوں کی کیا صورت اور سرگرمیاں تھیں۔ ہمارے اس سوال کے جواب میں زلفی صاحب نے فرمایا: ''۱۹۷۲ء میں، جب ہم نے ڈیلس فورٹ ورتھ (ٹیکساس) امریکہ سے، سعودی عربین ائر لائنز کے لیے چھ ماہ کی ٹریننگ مکمل کر لی تو اُس کے بعد اپنی ایک ماہ کی سالانہ چھٹیاں گزارنے کے لیے کینیڈا کا رخ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں بقول شخصے مٹھی بھر پاکستانی ہوا کرتے تھے اور ان میں سے بھی محض چندوہ۔ جو ادبی ذوق رکھتے تھے۔ لیکن ہم پھر بھی پروفیسر عزیز احمد صاحب اور انجمن اردو کینیڈا کے صدر پروفیسر حفظ الکبیر قریشی صاحب کی نیاز مندی میں، ہر سال اپنی بیشتر چھٹیاں ٹورانٹو میں ہی گزارا کرتے تھے۔ اور جب ہم اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے پیشِ نظر مستقل قیام کے لیے کینیڈا آ گئے۔ تو ہم بھی یہاں کی شعر وسخن کی محفلوں اور انعقادی سرگرمیوں کا حصہ بن گئے''۔ کینیڈا کے حوالے سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم نے زلفی صاحب سے کہا کہ۔ پاکستان میں آپ کے تعلیمی دور میں آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ افکار'' شائع ہوا جو کہ تعلیمی دور میں کسی کا شعری مجموعہ شائع

ہونے کے حوالے سے ایک نئی بات تھی۔ پھر اپنی تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ سعودی عرب واپس چلے گئے۔ اور اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس عرصے میں آپ کے دو شعری مجموعے ''دستاویز'' اور ''تنہا پرندے کی اڑان'' منصۂ شہود پر آئے۔ جبکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہاں کینیڈا میں آباد ہونے کے بعد مختلف اصناف میں آپ کی مزید پندرہ (۱۵) گرانقدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ذرا تناظر میں بھی کچھ بتایئے۔ زلفی صاحب نے فرمایا:

''شہرِ افکار (شاعری) ۱۹۶۶ء۔ دستاویز (شاعری) ۱۹۸۳ء۔ دنیائے تصوف (روحانی پیشواء۔ راہِ سلوک کی مسافرت) ۱۹۸۹ء۔ تنہا پرندے کی اڑان (شاعری) ۱۹۹۰ء۔ سخنور بہت اچھے (اہلِ قلم پر تنقیدی مضامین/رخاکے/منظومات) ۱۹۹۲ء۔ آگرہ سے نیاگرہ (سیاحی نظمیں۔ عالمی سفر نامہ) ۱۹۹۴ء۔ ابابیلیں نہیں آئیں (عالمی اہم واقعاتی نظمیں) ۱۹۹۵ء۔ سات سمندر پار/Beyond Seven Seas (اردو/انگریزی نظمیں) ۱۹۹۴ء۔ سلسلہ تکلم کا (اخباری کالموں کا مجموعہ) ۲۰۰۵ء۔ میری کتابیں (۹/تصنیفات کا انتخابی مجموعہ۔ ۱۰۱۶ صفحات) ۲۰۰۶ء۔ عبداللہ جاوید (شخصیت و فن۔ تنقیدی جائزہ) ۲۰۰۸ء۔ تسلیم الٰہی زلفی شخصیت و فن (۷۵/ممتاز اہلِ نقد و نظر کے تنقیدی جائزے۔ مرتب: معراج جامی) ۲۰۰۹ء۔ اردو ناول کی دریافت (ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ۔ مغربی تناظر میں) ۲۰۱۰ء۔ فیض احمد فیض بیروت میں (جلاوطنی کا دوسرا پڑاؤ) اکادمی ادبیاتِ پاکستان۔ اسلام آباد ۲۰۱۱ء۔ مغربی دنیا کے اردو اہلِ قلم (یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں آباد۔ ۱۵۰/اہلِ قلم کا تنقیدی جائزہ۔ ۵۲۴/صفحات) ۲۰۱۱ء۔ یہ عشق بھی

عجیب ہے (ساتواں شعری مجموعہ) اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کا کلام۔ ۴۵۰ صفحات ۲۰۱۲ء۔ زلفی صاحب نے اپنی دو درجن کتابوں کی تفصیل بیان فرما کر، وہ تمام کتابیں ہمیں بھی عنایت فرمائیں۔ تو ہم نے اپنے سامنے سجے ہوئے ان درجنوں: اعزاز، اسناد، میڈل، شیلڈ اور وثیقوں کی فہرست بھی بنالی جو تسلیم الٰہی زلفی کے اعتراف کمال کی منہ بولتی تصویر ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

۱۹۶۵ء: شاہ فیصل سعودی عرب کی جانب سے سند اور انعام (کہ اُس وقت نیشنل کالج کے طالب علم نے، بادشاہ سلامت کا پورٹریٹ بنا کر، کراچی ائر پورٹ پر استقبال کرنے والوں کی صف میں، صدرِ پاکستان جنرل ایوب خان کی موجودگی میں پیش کیا تھا)۔ ۱۹۶۸ء: بہترین شاعر (بین الجامعات پاکستان ایوارڈ۔ کراچی یونیورسٹی کی جانب سے)۔ ۱۹۶۸ء: بہترین کمپئر بزمِ طلباء (یونیورسٹی میگزین پروگرام ایوارڈ۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی جانب سے)۔ ۱۹۷۸ء: رکن (تاحیات) NASA کیلیفورنیا USA پلانیٹری ریسرچ ادارہ۔ ۱۹۸۴ء: بین الاقوامی ممتاز شاعر ایوارڈ (عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی۔ انڈیا کی جانب سے)۔ ۱۹۸۹ء: حُسنِ کارکردگی پیور گولڈ میڈل (بیس سالہ پیشہ ورانہ فنی خدمات، سعودی عربین ائر لائنز، جدۃ ائر پورٹ)۔ ۱۹۹۴ء: اعلیٰ ادبی تخلیقی صلاحیت کی اعترافی سند اور میڈل (حکومتِ کینیڈا، بمقام پارلیمنٹ ہاؤس، آٹواء)۔ ۱۹۹۹ء: بہترین شاعر (ایسٹرن نیوز کینیڈا کی جانب سے)۔ ۲۰۰۰ء: بہترین نغمہ نگار (ٹورانٹو فلم پروڈیوسرز کینیڈا کی جانب سے)۔ ۲۰۰۴ء کلیدی خطاب۔ کینیڈا اردو کی نئی بستی (اردو فیسٹول۔ لندن انگلینڈ)۔ ۲۰۰۸ء: اعترافی شیلڈ (رائٹرز فورم کینیڈا کی پچیس سالہ خدمات پر)۔ ۲۰۰۹ء: ایکسی لینس

ایوارڈ (پریمئر اونٹاریو کینیڈا' ڈیلٹن مکینٹی کی جانب سے)۔ ۲۰۱۰ء: جوئیل آف دی ساؤتھ ایشین کمیونٹی ایوارڈ (محفل گروپ کینیڈا کی جانب سے)۔ ۲۰۱۱ء: ''ستارۂ امتیاز'' حکومتِ پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز (اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد کی نامزدگی)۔ ۲۰۱۱ء: علمی' ادبی اور ثقافتی دنیا کے نو (۹) ممالک: پاکستان' انڈیا' انگلینڈ' امریکہ' کینیڈا' جرمنی' سوئیڈن' ڈنمارک اور کویت کے اہم' بڑے اور مشہور اداروں کے سربراہوں نے ۲رجولائی ۲۰۱۱ء کو ٹورانٹو میں منعقدہ ایک بین الاقوامی تقریب میں فنونِ لطیفہ کے نامور ادبی اسکالر اور عالمی شہرت یافتہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب کو اپنے اپنے اداروں کی جانب سے: اعزاز' اسناد' میڈل' شیلڈ اور وثیقے پیش کیے۔ واضح رہے کہ ایک وقت میں' کسی ایک شخصیت کو (۹) عالمی ایوارڈ دیئے جانا ایک ریکارڈ ہے۔ جو جناب تسلیم الٰہی زلفی پر قائم ہوا ہے۔ اب ذرا ان ایوارڈز کے ٹائٹل بھی ملاحظہ فرمایئے: سفیرِ ادب ایوارڈ۔ ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ' گولڈ میڈل اور شال۔ وقارِ اردو ایوارڈ۔ افتخارِ اردو ایوارڈ۔ لٹریری اسکالر ایوارڈ۔ فیض احمد فیض ایوارڈ۔ آفتابِ اردو ایوارڈ۔ سخن شناس ایوارڈ۔ وثیقۂ اعترافِ کمال۔ ایکسی لینس ایوارڈ۔ ''غالب میموریل ٹرسٹ لاہور۔ پاکستان کی جانب سے 'انٹرنیشنل غالب کانفرنس لاہور' کے موقع پر تسلیم الٰہی زلفی صاحب کو ''تمغۂ فروغِ اردو دنیائے مغرب'' پیش کیا گیا ہے۔ ''روزن ادبی ایوارڈ'' ورلڈ پنجابی فورم۔ روزن ادبی فورم۔ گجرات پاکستان کی جانب سے۔ ''بیسٹ لٹریری اسکالر'' پریڈ آف نیشن کارنوال۔ کینیڈا کی جانب سے۔ ''وثیقۂ اعترافِ کمال'' استنبول یونیورسٹی ترکی کی جانب سے۔ ۲۰۱۲ء میں زلفی صاحب نے برلن میں ''بین الاقوامی اردو مرکز یورپ'' کا افتتاح کیا' اُس موقع پر انہیں ''پاسبانِ اردو''

ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اور ستمبر ۲۰۱۲ء میں محقق تسلیم الٰہی زلفی نے گوئٹے انسٹیٹیوٹ اور میوزیم کا دورہ کیا اور وہاں موجود ہائڈل برگ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کو "گوئٹے کے افکار" کے عنوان سے سیر حاصل توسیعی لیکچر دیا۔ نومبر ۲۰۱۲ء: اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کی خصوصی دعوت پر اسلام آباد تشریف لے گئے جہاں، چیئرمین عبدالحمید نے PAL ہال میں ادبی اسکالر تسلیم الٰہی زلفی کے اعزاز میں پر تکلف ظہرانے کے بعد استقبالی تقریب اور شعری نشست کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر مہمانِ گرامی کو اکادمی کی اہم مطبوعات کا تحفہ بھی پیش کیا گیا۔ اُدھر لاہور کی الحمراء ادبی بیٹھک، آرٹس کونسل کی خوبصورت ساعت گاہ میں تسلیم الٰہی زلفی کی اٹھارویں کتاب اور آٹھویں شعری مجموعہ "یہ عشق بھی عجیب ہے" کی پروقار تقریبِ اجراء منعقد کی گئی۔

تسلیم الٰہی زلفی صاحب تو، نہ ہی چائے پیتے ہیں اور نہ ہی سگریٹ۔ لہٰذا ہم نے اپنے آگے رکھے ہوئے چائے کے کپ سے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے ٹورانٹو میں آجکل ان کے معمولاتِ زندگی کے بارے میں جاننا چاہا۔ انہوں نے بتایا کہ: "صبح سات بجے بیدار ہونے پر معمولات سے فراغت کے بعد ہم اپنا کمپیوٹر آن کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی ای میل چیک کرتے ہیں۔ جس کے بعد کمپیوٹر پر ہی، اُس روز کے اپنے ٹی وی پروگراموں کے اسکرپٹ اور شیڈول وغیرہ مرتب کرنا ہوتے ہیں۔ اپنا معمول کا یہ کام مکمل کر کے ناشتے کے بعد ہم ٹی وی اسٹیشن روانہ ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہر روز اپنی ٹیم کے ساتھ چار گھنٹے کی دورانیئے کے مختلف اردو پروگراموں اور شوز کی ریکارڈنگ کر کے آن ائر کرتے ہیں۔ شام ڈھلے گھر واپسی ہوتی ہے۔ اور پھر رات بارہ بجے سے دو بجے تک ہم صرف لکھنے پڑھنے کا کام کرتے

ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی سربراہی میں قائم دواداروں Urdu Society of University of Karachi Graduates اور Canada Forum Canada کے بینر تلے عالمی علمی ادبی اجتماعات، کانفرنسوں، سیمنار، سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد بھی پابندی سے کرتے رہتے ہیں۔ جس میں دنیا بھر کے اہلِ قلم مدعو کیے جاتے ہیں۔ اپنی ادارت میں ایک علمی، ادبی اور ثقافتی، ششماہی مجلّہ "الجامعہ" بھی یہیں چھپوا کر شائع کرتے ہیں۔ ہر سال علمی اور ادبی نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر ادبی دنیا کے کسی ایک قلم کار کو پانچ ہزار ڈالر کا "جامعہ کراچی ادبی ایوارڈ" بھی دیتے ہیں۔ اور ان تمام کاموں کے ساتھ دنیا بھر میں منعقد ہونے والے علمی ادبی اجتماعات میں شرکت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

﴿ تسلیم الٰہی زلفیؔ صاحب سے رابطہ ﴾

**Mr.Tasleem Elahi Zulfi**

142 Oxford Street
Richmond Hill, Ontario
L4C 4L7 - Canada
Website: www.zulfi.ca
E-mail: zulfi@rogers.com
Facebook: Tasleem Elahi Zulfi
U-Tube: Tasleem Elahi Zulfi
Canadian TV Channel - Rogers Cable 851
Mobile: 001 416 737 3458

### شعر و ادب اور نشر و اشاعتی دنیا کی نامور شخصیت

# فنونِ لطیفہ کے ادبی اسکالر تسلیم الٰہی زلفی سے قلمی گفتگو

انٹرویو: شائستہ زرّیں (کراچی)

---

بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن اور ہنر میں ارجمند ہوتے ہیں۔ اس پر طرّہ اللہ تعالٰی کی عطائے خاص سے زرخیز تخلیقی اور بے بہا تحقیقی ذہن اُن کا اختصاص اور امتیاز ہوتا ہے۔ جناب تسلیم الٰہی زلفی بھی ان ہی میں سے ایک ہیں جو فنونِ لطیفہ کی تقریباً تمام اصناف پر دسترس رکھتے ہیں۔

مؤقر ادبی جریدے ''آفاقی'' نومبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں زلفی صاحب کا تفصیلی انٹرویو پڑھا۔ جو شعیب صادق صاحب نے زلفی صاحب سے کئی نشستوں میں بالمشافہ گفتگو کے بعد مرتب کیا۔ یہ نہایت دلچسپ اور معلومات افزاء انٹرویو پڑھنے کے بعد جہاں زلفی صاحب کی شخصیت و فن سے آگاہی ہوئی' وہاں یہ انکشاف بھی ہُوا کہ زلفی صاحب کے ذہن میں سنہ ساٹھ کے عشرے کی پاکستان بالخصوص کراچی کی علمی و ادبی دنیا آباد ہے۔ انٹرویو پڑھ کر کئی ایک سوال میرے ذہن میں آئے' جن کے جواب جاننے کی خواہش میں زلفی صاحب سے رابطہ کیا' آپ نے جس ذمّہ داری اور دیانتداری سے یادوں کے انمول خزانے کی حفاظت کی ہے' اسی لگن اور اخلاص سے ہمارے سوالوں کے جواب دیے۔ یوں بھی ہُوا کہ زلفی صاحب کے جواب پڑھ کر چند اور سوال ذہن میں جنم لیتے جو فوری ای میل کر دیتی۔ اسی دوران پروفیسر یونس شرر صاحب کا دلچسپ مضمون ''کراچی یونیورسٹی کے کنہیا۔ ادبی یونیورسٹی کے اسکالر'' پڑھا اور اس کی روشنی میں مزید

سوال زلفی صاحب کو ارسال کردیے۔ آپ نے جواب تحریر کیے۔ بالآخر قلمی سوال و جواب کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اور یہ انٹرویو زلفی صاحب کے اِس شعر کی تفسیر ہے ۔

ہم اکثر قصّۂ ماضی ادھورا چھوڑ دیتے ہیں
کتابِ زیست کے صفحے کا کونا موڑ دیتے ہیں

۱۹۶۰ء کی دہائی کے کئی کہے اَن کہے قصّے ابھی بھی زلفی صاحب کے ذہن کا صفحہ مُڑی ہوئی حالت میں محفوظ اور قارئین اُن سے محروم ہیں۔

زلفی صاحب کا وعدہ ہے کہ وہ ان شاء اللہ ریٹائر ہونے کے بعد اپنی خودنوشت میں تمام یادیں اور باتیں مفصّل تحریر کریں گے۔ سرِ دست جو میّسر ہیں اُن ہی یادوں سے محفوظ ہوتے ہیں ............... (شائستہ زرّیں)

---

س: آپ نے ابتدائی تعلیم سعودی عرب کے عربی اسکول سے حاصل کی، اردو آپ کی درسی تعلیم کا حصہ نہ تھی، آپ نے اردو کی تعلیم کب اور کیسے حاصل کی؟

ج: جب ہم چار سال کے ہو گئے تو ہمارے والدین نے ہمیں جدّہ کے پرائمری اسکول مدرسة الفلاح میں داخل کروادیا۔ جہاں دستور کے مطابق ہمیں صرف قرآن، فقہ اور حدیث کے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ جبکہ دیگر دنیاوی علوم اور اردو/ انگریزی زبان کی پرائمری تعلیم ہم نے گھر پر اپنے والدین سے حاصل کی۔ جس کی تدریس کیلیے پاکستان ایجوکیشن بورڈ کی آٹھویں کلاس کا کورس منگوایا گیا۔

س: آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز میں قرآن، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کیا نوعمری کا یہ دور اس تعلیم کیلیے موزوں تھا؟ آپ نے اپنی اس ابتدائی تعلیم سے کیسے فیض اٹھایا؟

ج: آپ کے اس سوال کے پہلے حصے کا جواب تو سعودی نظامِ تعلیم سے آ گاہی کا متقاضی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سعودی عرب میں ہر بچے کو پرائمری اسکول (مدرسة الابتدائیه) میں صرف اور صرف قرآن، حدیث اور فقہ پڑھایا جاتا ہے۔ دیگر دنیاوی علوم کی تعلیم ہرگز نہیں دی جاتی۔ (یہ ہم اپنے زمانے ساٹھ سال پہلے کی بات کر رہے ہیں)۔ کہ اب تو جب سے وہاں بھی پرائیویٹ انگریزی اسکول کھل گئے ہیں، دینی علوم کے ساتھ ساتھ پہلی کلاس سے ہی انگریزی تعلیم بھی دی جارہی ہے۔ اب جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو۔ یہ ہماری ابتدائی خالص دینی تعلیم کا ہی فیض ہے کہ جب ہم قرآن پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمیں حرف بہ حرف سیاق و سباق کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیا فرما رہے ہیں۔ کہ ہمیں اس کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح فقہ و حدیث پڑھنے کے بعد۔ کسی فرقہ بند عالم کی لکھی قرآنی تفسیر کی ضرورت بھی نہیں ہوتی ہے۔ کہ نوعمری میں سیکھا ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ اور پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد انسان اپنے شعور و عقل کی بیداری کے ساتھ ان امور پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور و فکر کرتا ہے۔ خود بھی مستفیض ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی فیضیاب کرتا ہے۔ وما توفیقی اِلّا باللہ۔

س: اردو کی تعلیم حاصل کرنے میں خود آپ کو کتنی دلچسپی تھی؟

ج: عربی زبان کی مشہور کہاوت ہے کہ: الشاعر" یولد ولا یصنع یعنی A Poet is born, not made اور اسی کہاوت کے مصداق، ہم بھی، اردو اپنی مادری زبان ہونے کے ناتے، اردو زبان سے ادب

تخلیقی رغبت کے ساتھ پیدا ہوئے تھے۔

س: عرب و مغربی ممالک میں مقیم وہ بچے‘ اردو جن کی مادری زبان ہے‘ لیکن اُن کی درسی تعلیم کا حصہ نہیں‘ ایسے اطفال کے لیے کیا آپ کسی ایسی کتاب کی ضرورت محسوس کر۔ تے ہیں جو ابتدائی جماعتوں ہی سے بچوں کو اردو پڑھنے لکھنے سیکھنے اور سمجھنے کی طرف مائل کر سکے؟

ج: جی یقیناً۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ سنِ فکر و شعور کو پہنچنے کے بعد سنہ ساٹھ کی دھائی میں جب ہم نے اردو جرائد و مجلّات میں با قاعدہ لکھنا شروع کر دیا تو تدریسی اردو کتب کی تاریخ میں پہلی بار ’’برِ صغیر کے بیرونِ ملک آباد بچوں کے لیے‘‘ (اردو تعلیم کی ابتدائی کتاب) ترتیب دی اور اسے شائع کروا کر دوستوں کے ذریعے‘ شرقِ اوسط‘ افریقہ‘ یورپ اور شمالی امریکہ بھجوایا۔

س: بہت خوب اردو زبان کی خدمت کی یہ اولین کاوش بلا شبہ آپ کا قابلِ قدر کارنامہ ہے، جب آپ کی مرتب کی گئی کتاب بیرونِ ممالک میں پہنچی تب اُس کا کیا نتیجہ سامنے آیا؟

ج: بہت ہمت افزا اور پُر جوش پزیرائی ملی ہماری اُس کاوش کو۔ اور اُس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر‘ وہ تمام لوگ جنہیں کتاب بھجوائی گئی تھی۔ اپنے اپنے ملکوں میں مقامی طور پر درجنوں بار Re-produce کر چکے ہیں۔

س: ’’اُردو تعلیم کی ابتدائی کتاب‘‘ آپ نے محض (۱۶) برس کی عمر میں ترتیب دی تھی کل کی بہ نسبت آج اردو زبان سے والدین کی عدم توجہی کے سبب بچے

اردو سے زیادہ دور ہوتے جارہے ہیں کیا پانچ دہائیاں گزرنے کے بعد اس کے نئے اضافہ شدہ ایڈیشن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

ج: قطعیٔ نہیں۔ کہ جو ابتدائی الف بے کا قاعدہ ہم نے اپنے بچپن میں پڑھا تھا۔ وہی کتاب اب تک بچوں کو پڑھائی جارہی ہے۔

س: پاکستان آنے کے بعد بچوں کے لیے لکھنے کا آغاز کب اور کیسے ہُوا؟

ج: ہم نے اپنے بچپن ہی سے عربی اور اردو میں چھوٹی چھوٹی نظمیں اور کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ اور جب ۱۹۵۸ء میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کراچی پہنچے تو ہمارے شعری اور ادبی رجحان کو دیکھتے ہوئے ہمارے پھوپا محمود الزماں خاں نیازی صاحب نے ہمیں اپنے پیر بھائی حضرت بہزاؔد لکھنوی کی شاگردی میں دے دیا۔ جنہوں نے سب سے پہلے تو (ہماری دراز زلفیں دیکھ کر) ہمیں ''زلفی'' کا تخلص دیا۔ اور اس کے بعد باقاعدہ علمِ عروض کی تعلیم دی۔ جبکہ ان ہی دنوں نثر نگاری کے لیے ہم نے روزنامہ جنگ کراچی میں بچوں کے صفحات ''نونہال لیگ'' کے انچارج شفیع عقیل صاحب سے ملاقات کی اور ان کے مشورے سے' جدہ سے اپنے ساتھ لائی ہوئی' بچوں کی عربی کہانیوں کی کتابوں کے اردو ترجمے اخبار جنگ کے لیے لکھنا شروع کردیے' جنہیں شفیع عقیل صاحب کے ساتھ سب بچوں اور بڑوں نے بیحد پسند کیا اور سراہا۔ اور تب ہی سے ''ہمدرد نونہال''، ''تعلیم و تربیت''، ''کھلونا'' اور کراچی سے شائع ہونے والے کامل قریشی صاحب کے ''بچوں کا اخبار'' میں بھی ہماری نظمیں اور کہانیاں چھپنا شروع ہوگئیں۔

س: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آگے جا کر آپ نے عالمی سطح پر مختلف اداروں کے لیے جو تراجم کیے وہ ایک پل کی ستائش اُس کا حرفِ آغاز تھی؟

ج: یقیناً۔ یہ میری اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ابتداء میں میرے سینئرز کی قدردانیاں اور ہمت افزائیاں ہی تھیں جن کے سہارے میرے ترجمے کے کام کو بڑھاوا ملا۔ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۸ء میں مجھے NASA کیلیفورنیا USA پلانیٹری ریسرچ ادارہ نے اپنا ممبر بنایا اور اپنی ریسرچ دستاویز کے اردو/عربی ترجمے کا کام سونپا۔ تاکہ برِ صغیر اور شرقِ اوسط کے ممالک اجرامِ فلکی کی اس تحقیق سے مستفید ہو سکیں۔ جب کہ اُنہیں دنوں یعنی ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی ''عالمی اہلِ قلم کانفرنس'' میں حکومتِ پاکستان نے ہمیں ''ترجمے کے مسائل'' کے موضوع پر پیپر پڑھنے کے لیے سعودی عرب سے بلایا۔ اور پھر اُس دن تو ہماری خوش بختی اور خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ جب ہم سفارتخانۂ پاکستان سعودی عرب کی درخواست پر صدرِ پاکستان جرنل ضیاء الحق کے ترجمان (Interpreter) کی حیثیت سے امامِ کعبہ الشیخ السبیل کے ساتھ ان کی میٹنگ میں شریک ہوئے۔ جس کے بعد صدرِ پاکستان کی معیت میں ہمیں خانۂ کعبہ اور روضۂ اطہر ﷺ کے اندر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

س: گویا یہ اعزاز آپ کے ساتھ ساتھ شفیع عقیل صاحب کے حصے، میں بھی جاتا ہے، جنھوں نے آپ کی خفتہ صلاحیتوں کو جانچ لیا تھا؟

ج: بلاشبہ۔ یہ سب کچھ ''بھائیجان'' کی جوہر شناس نگاہی کا مرہونِ منت ہے!۔

س: بچوں کے لیے طبع زاد کہانیاں لکھنے میں زیادہ لطف آیا یا ترجمہ کہانی میں؟

ج: سچ بات تو یہ ہے کہ جو لطف ''طبع زاد'' تخلیقی عمل میں ہے۔ وہ ترجمے میں کہاں!!

س: بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں میں آپ کے موضوعات کیا ہوتے تھے؟

ج: آپ کے اس سوال کے جواب کے حصول کے لیے مجھے سنہ ساٹھ کی دھائی میں ہر ہفتے / مہینے شائع ہونے والی اپنی محفوظ نثری اور شعری مطبوعات کے تراشوں کی فائل نکالنا پڑی۔ جس کے مطابق بچوں کے لیے سال بہ سال میرے موضوعات کچھ یوں تھے:

☆ ''حسان اور لومڑی'' (عربی سے ترجمہ) مطبوعہ: ہونہال لیگ۔ روزنامہ جنگ کراچی ۹رجنوری ۱۹۶۲ء ☆ ''ریڈیو طفلستان کمرشل سروس'' (اُس زمانے میں کراچی ریڈیو سے پہلی بار کمرشل سروس شروع ہوئی تھی) مطبوعہ ''بچوں کا اخبار'' ۷رستمبر ۱۹۶۳ء۔ ☆ ''چاند کا سفر'' (واضح رہے اُس وقت تک انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا) مطبوعہ ''ہونہار لیگ'' (انچارج امداد نظامی صاحب) روزنامہ انجام ۲۴راپریل ۱۹۶۴ء ☆ ''جاگو اور جگاؤ'' (نظم) مطبوعہ ماہنامہ ہمدرد نونہال۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء ☆ ''بچوں کا پیراشوٹ'' (قلمی تصویروں کے ذریعے بچوں کا پیراشوٹ بنانے کا طریقہ بتایا) مطبوعہ ماہنامہ ہمدرد نونہال۔ نومبر ۱۹۶۵ء ☆ ''ہمیں درسی کتابوں کے علاوہ ہر موضوع پر لکھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالنا چاہیے'' مطبوعہ روزنامہ انجام ۵رجنوری ۱۹۶۶ء

☆ ''بچے ۲۳ر مارچ کیسے منائیں'' مطبوعہ روزنامہ جنگ ۲۳ر مارچ ۱۹۶۷ء۔ وغیرہ وغیرہ۔

س: اُس زمانے میں بچوں کے رسائل میں لکھنے والے بچوں کے نام یاد ہیں جو آج نامور اہلِ قلم میں شمار ہوتے ہیں؟

ج: جی ہاں اُس زمانے میں لکھنے والے ہمارے بیشتر نوعمر ہم قلم۔ آج کی نامور ادبی شخصیات میں شامل ہیں جیسے: انور شعور، عبید اللہ علیم، نصیر ترابی، پیرزادہ قاسم، ثروت حسین، جمال احسانی، تنویر پھول، امجد اسلام امجد، ایوب خاور، نیرؔ بن سوز، صفورہ خیری، نوشابہ صدیقی، تاجدار عادل، جاوید منظر، نقاش کاظمی، وضاحت نسیم اور بہت سارے جن کے نام اِس وقت ذہن کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں۔

س: آپ اپنے بچپن میں بچوں کے کن ادیبوں، شاعروں اور بچوں کے رسالے کے کس مدیر سے متاثر تھے؟

ج: ہمارے بچپن میں، بچوں کے لیے لکھنے والے ادیبوں اور شعراء میں: مسعود احمد برکاتی، کوثر چاند پوری، عشرت رحمانی، علی ناصر زیدی، شان الحق حقی، مسلم ضیائی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شاعر لکھنوی، محشر بدایونی، اشرف صبوحی، میرزا ادیب اور ماہر القادری وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ ہمیں متاثر کرنے والے بچوں کے رسالوں کے مدیران میں مسعود احمد برکاتی صاحب سرِ فہرست ہیں۔ جب تیرہ سال کی عمر میں ہم اپنی پہلی نظم لے کر ''نونہال'' کے دفتر واقع پرانی نمائش، نزد مزارِ قائد، برکاتی صاحب کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ

ہمارے سامنے ایک خوب صورت اور وجیہہ شخصیت مدیرِ اعلا کی کرسی پر جلوہ افروز ہے، جن کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر بجی لطیف شفقت آمیز مسکراہٹ نے ہمیں حوصلہ دیا۔ اور ہم نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں قدرے ٹھہراؤ محسوس کیا، لہٰذا۔ سلام کے بعد پورے اعتماد کے ساتھ اپنی پہلی کاوش انہیں پیش کردی۔ انہوں نے نظم پڑھنے کے بعد ہم سے فرمایا۔ ''آپ وہی تسلیم الٰہی زلفی ہیں جو اخبار جنگ میں بچوں کے صفحات کے لیے عربی کہانیاں ترجمہ کرتے ہیں!؟۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ نونہال کے لیے بھی لکھا کریں''۔ اور ''آپ اِسے چھوڑ جایئے'' کہکر ہماری نظم رکھ لی۔ اور ہم نے دیکھا کے ''نونہال'' کے اگلے شمارے میں ہماری نظم شامل تھی۔ اور پھر اگست ۲۰۰۶ء میں جب ہم اپنی دسویں کتاب کی اشاعت کے موقع پر کینیڈا سے کراچی گئے ہوئے تھے تو برکاتی صاحب نے ہمیں ''نونہال اسمبلی'' سے خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ہمیں ہمدرد کی جانب سے ''وثیقۂ اعترافِ کمال'' بھی عطاء فرمایا۔ لیکن جب ہم نے انہیں اپنی نئی کتاب پیش کی تو۔ اُس وقت ہماری وہی کیفیت تھی جو اپنی پہلی نظم بغرضِ اشاعت پیش کرتے وقت پورے (۴۴) سال پہلے تھی!۔ گذشتہ چھ دھائیوں میں ''نونہال'' کے ذریعے برکاتی صاحب نے پاکستانی نونہالوں کی چھ نسلوں تربیت کی ہے۔ اور مجھے شرف حاصل ہے کہ میرا تعلق تربیت پانے والی پہلی نسل سے ہے۔ پاکستان میں بچوں کی تہذیبی، اخلاقی، لسانی تربیت اور ایک اچھا شہری بنانے کی سعیِ مسلسل کے حوالے سے مسعود احمد برکاتی کا نام سنہری

حروف سے لکھا جاتا ہے۔ سادہ مزاج، وضعدار، کم گو اور کم آمیز برکاتی صاحب، اپنے جدِ امجد ممتاز عالمِ دین علامہ حکیم برکات احمد صاحب کی طرح عزّت، شہرت اور دانشوری کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ بیس سال کی عمر میں ۱۹۵۳ء سے ''نونہال'' کی ادارت سنبھالنے والے مسعود احمد برکاتی نے ۱۹۹۶ء میں APNS کی جانب سے پاکستان کے سب سے سینئر پروفیشنل ایڈیٹر کی حیثیت کا نشانِ سپاس حاصل کیا۔ برکاتی صاحب ''ہمدرد فیملی'' کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حکیم محمد سعید صاحب نے ہمیشہ ان کے خلوص، عزم، جذبے، لگن، محنت، صلاحیت اور انتظامی سلیقے کو قدر، اہمیت اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اب یہی جذبہ ہم حکیم صاحب کی لائق صاحبزادی سعدیہ راشد صاحبہ میں دیکھتے ہیں، جو برکاتی صاحب کی حد درجہ قدرداں ہیں۔

س: آپ نے کس عمر تک بچوں کے لیے لکھا؟

ج: بچوں کے لیے لکھنے میں عمر کی کوئی حد نہیں۔ لیکن مجھ جیسے قلم کاروں کے لیے، جن کا اختصاص بچوں کا ادب نہیں۔ ایک مخصوص عمر کے بعد تواتر کے ساتھ بچوں کے لیے لکھنا مشکل ہو جاتا ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں۔ پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کر لینے پر سعودی عرب واپسی اور وہاں سے امریکہ تربیت کے لیے جانے کے بعد سے ہم بچوں کے لکھنے کو جاری نہ رکھ سکے۔ کیونکہ اب ہم نے دقیق ادبی پرچوں کے لیے غزلیہ شاعری اور تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔

س: کیا سبب ہے کہ اپنے بچپن ہی سے بچوں کے ادب میں نام کمانے والے

جب بڑوں کے لیے لکھنا شروع کرتے ہیں تو بچوں کے ادب سے دور ہو جاتے ہیں؟

ج: ہماری نظر میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بچوں کا ادب لکھنے والوں کو' بچوں کے رسائل سے بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ نیز انہیں مشاعروں اور کانفرنسوں میں بھی نہیں بلایا جاتا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے' کلاسیکل ادب تخلیق کرنے والوں میں شمار نہیں کئے جاتے اور شعری ونثری ادب کے تذکروں میں شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر بڑے ہونے والے بچے بھی عاقل وبالغ ہونے کے بعد انہیں بھول کر قرۃ العین حیدر اور پروین شاکر کے مداح ہوجاتے ہیں!!

س: گویا معاشرے کے بے حد حساس طبقے کا نمائندہ مصلحتوں کا شکار ہوکر بچوں کے ادب سے دور ہو جاتا ہے، کیا خطیر معاوضہ نہ ملنااور مشاعروں اور کانفرنسوں میں شرکت نہ کرنے کا صدمہ اتنا بڑا ہے کہ اس کی خاطر بچوں کا بہترین ادب تخلیق کرنے والے اپنے منصب سے دور ہوجائیں؟

ج: رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!

س: آپ بچوں کے لیے شائع ہونے والی اپنی نثری وشعری تخلیقات اور تراجم کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

ج: جی یقیناً۔ اگر بچوں کے لیے لکھی گئی میری نثری وشعری تخلیقات' کوئی پبلیشر کتابی شکل میں شائع کرنا چاہے تو مجھے بیحد خوشی ہوگی۔

س: مصوری اور خطاطی کا آغاز کس عمر سے کیا۔ اور پھر اسے جاری کیوں نہیں رکھا؟

ج: یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جس طرح ہر انسان میں فنونِ لطیفہ کے کسی نہ کسی شعبے سے فطری دلچسپی ہوتی ہے۔ جسے وہ اپنی لگن اور ریاضت سے پروان چڑھاتا ہے۔ لیکن بعض ''خاص'' لوگوں میں قدرتی طور پر فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں کی سمجھ بوجھ ہوتی ہے۔ اور یہ نابغۂ روزگار لوگ دنیا کے تمام علوم وفنون اور تمام مظاہرِ فطرت کی بنیادی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ فنونِ لطیفہ کے ان ادبی اسکالروں کو پتھر سے تراشا ہوا کوئی مجسمہ دکھائیں تو وہ اس کی تراش خراش اور نشیب وفراز میں سانس لیتی زندگی کو دیکھ سکیں گے۔ اسی طرح اگر آپ انہیں کسی مصور کی پینٹنگ یا پورٹریٹ دکھائیں تو وہ اس کے خطوط، دائرے اور قوس کو کسی تحریر کی طرح اس طرح پڑھیں گے کہ وہ تصویر منہ سے بولنے لگے گی۔ اگر آپ انہیں موسیقی کی اچھی دُھن یا شعلے کی طرح لپکتی آواز سنائیں گے تو وہ اُس کے کامیاب سُر، تال، گت، ٹھاٹھ، راگ، ٹھیکہ، دُھرپد اور جگہ کی صحیح نشان دہی کریں گے۔ ہم نے مصوری اور خطاطی کی باقاعدہ تربیت یا تعلیم حاصل نہیں کی۔ البتہ اسے ہمارا ایک فطری شوق اور مشغلہ کہا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے بعض لوگ ان صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی عملی زندگی میں جب جب موقع اور وقت مِلتا ہے انہیں جِلا بخشتے ہیں۔ اوائلِ عمری میں تو ہم نے خوب خطاطی اور مصوری کر کر کے اپنی مشق بڑھائی۔ اب ظاہر ہے اُس زمانے میں کمپیوٹر تو ابھی پاکستان پہنچا نہیں تھا۔ اور نہ ہی خطِ نستعلیق کی کمپوزنگ ہوتی تھی۔ لہٰذا ہم شوقیہ طور پر بیشتر اپنے ''ویکلی کراچی''

کی کتاب خود ہی کیا کرتے تھے۔اور اسی طرح مصوری بھی جاری تھی۔اور تب ہی ۱۹۶۵ء میں جب سعودی عرب کے شاہ فیصل پاکستان کے سرکاری دورے پر وفاقی دار الحکومت کراچی تشریف لائے تو۔اُس زمانے میں نیشنل کالج کے ایک ''ہرفن مولا'' نمایاں طالب علم کی حیثیت سے ہم اپنی شہرت کی بلندیوں پر تھے۔اور ایوارڈ یافتہ: پڑھاکو طالب علم' مقبول شاعر' چہار لسان مترجم' قادر الکلام مقرر' معروف براڈ کاسٹر اور شوقیہ مصور کی حیثیت سے کراچی میں معروف تھے۔لہٰذا صادقین صاحب کے مشورے کے بعد شاہ فیصل کی استقبالی (Protocol) کمیٹی نے یہ اعزاز ہمیں بخشا کہ ہم ایک طالب علم کی حیثیت سے شاہ فیصل کا پورٹریٹ بنائیں اور صدرِ پاکستان جنرل ایوب خان کی موجودگی میں کراچی ائرپورٹ پر استقبال کرنے والوں کی صف میں کھڑے ہوکر عربی زبان میں استقبالی کلمات کے ساتھ خوش آمدید کرتے ہوئے شاہ کو پیش کریں۔اور جب ہم نے شاہ کو عربی زبان میں استقبالی کلمات کے ساتھ خوش آمدید کرتے ہوئے پورٹریٹ پیش کیا۔تو انہوں نے حیرانی کے ساتھ ہمیں دیکھا۔اور گویا ہوئے۔یہ عربی آپ نے کہاں سے سیکھی !؟۔اور جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم پاکستان پڑھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔تو بہت خوش ہوئے۔ہمارا کاندھا تھپ تھپاتے ہوئے اپنے سفیر سے فرمایا کہ۔ہماری طرف سے زلفی کو انعام و اعزاز دیا جائے۔جس کی خبر دوسرے دن کے اخبارات میں نمایاں طور پر شائع کی گئی۔اور جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ مصوری اور خطاطی ہمارا اوائل عمری کا مشغلہ ہے' فیلڈ نہیں (نہ

ہی ہم نے مصوری حسینوں کے لیے سیکھی ہے )۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ جب ہم نے اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا ہجرت کی تو اُس وقت تک کمپیوٹر کمپوزنگ کا کوئی اردو سافٹ ویئر نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اُس موقع پر ہماری خطاطی کی صلاحیت کام آئی۔ اور ہم نے ٹورانٹو سے شائع ہونے والے اردو جریدوں 'الہلال' 'پاکیزہ' 'ملاقات' 'سخنور' 'آزاد' وغیرہ میں شائع ہونے والی اپنی تحریروں اور رپورٹوں کی خود کتابت کی۔ اسی طرح جب کبھی موڈ بن جائے تو اب بھی مصوری کر لیتے ہیں۔ ہمارے غریب خانے اور دوستوں کے گھروں میں آج بھی ہماری Paintings آویزاں ہیں۔

س: آپ نے تذکرہ کیا تھا حضرت بہزاؔد لکھنوی نے آپ کو علمِ عروض کی تعلیم دی اس کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری کی تربیت میں حضرت بہزاؔد لکھنوی نے کن امور کو پیشِ نظر رکھا؟

ج: بہزاؔد صاحب نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ۔ ''ہماری تہذیبی اور روایتی شاعری کے ضمن میں میرؔ و غالبؔ سے لیکر اقبالؔ و فیضؔ تک۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس صنفِ سخن کا اِکمال ہے۔ لہٰذا اِس زمانے میں' جب آپ کوئی خیال یا بات شعر بند کریں گے تو وہ ''اچھوتا'' نہیں کہلائے گا۔ اس لیے بھرتی کے شعر کہنے کے بجائے۔ اپنے اظہارِ سخن میں عصری زبان ولہجہ اپنا کر انفرادیت پیدا کریں''۔

س: آپ کے خیال میں شاعری میں اسلوب کی زیادہ اہمیت ہے یا عروض کی؟

ج: جس طرح کوئی بھی معیاری تحریر' اُس زبان کی گرامر کے اصول پر' مروّجہ اسلوب میں لکھی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک معیاری شعر بھی عروض کے

اصول اور مروّجہ اسلوب میں لکھا جاتا ہے۔

س: آپ نے حضرت بہزاد لکھنوی کے شاعرانہ اسلوب اور طرزِ فکر کا براہ راست اثر قبول کیا؟

ج: علمِ عروض کے استاد کے شاعرانہ اسلوب اور طرزِ فکر کی پیروی لازم نہیں ہے۔ سو ہم نے بھی نہیں کی!

س: آپ کی پہلی غزل کب اور کس ادبی جریدے میں شائع ہوئی؟

ج: ہماری پہلی غزل جس بڑے اور دقیق ادبی رسالے کے جولائی ۱۹٦٦ء کے شمارے میں شائع ہوئی وہ ''الشجاع'' ہے۔

س: محض اُنیس (۱۹) برس کی عمر میں پہلے شعری مجموعے کی اشاعت ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اس کی اشاعت پر آپ کے استادِ محترم حضرت بہزاد لکھنوی اور ہم عصر شعراء کے کیا تاثرات تھے ؟

ج: سب ہی نے بیحد مسرت کا اظہار کیا۔ لیکن جہاں تک حیرت کا تعلق ہے۔ وہ کسی کو نہ ہوئی۔ شاید اس لیے کہ سب لوگ ہمیں ۱۹٦۲ء سے پڑھتے اور سنتے آرہے تھے۔ ہاں البتہ یہ سب نے کہا کہ پاکستان کی ادبی تاریخ میں، کسی کالج کے طالب علم کا شعری مجموعہ شائع ہونا نئی بات ہے!۔ لہٰذا ۱۹٦٦ء میں ہمارا پہلا شعری مجموعہ ''شہرِ افکار'' منصۂ شہود پر آیا تو گویا ہمیں پَر لگ گئے اور پاکستان و ہندوستان کے تمام ادبی مجلّات میں ہماری تخلیقات تواتر سے شائع ہونا شروع ہوگئیں، جن میں: الشجاع، نئی قدریں، ادبِ لطیف، نیرنگِ خیال، افکار، سیپ، فنون، اوراق، شاعر، شب خون، قومی زبان، ماہِ نو، نیا دور، جامِ نو، اقدار،

بیسویں صدی، شمع، سخنور، طلوعِ افکار، صریر، ادبیات، اردو پنچ، محفل، منشور، تخلیق، الفاظ، بازگشت، رابطہ، انشاء، پرواز، سفیرِ اردو، آفاقی، ارتقاء، سبق اردو، مباحثہ، دستک، اسباق، اثبات، اردو چینل، خیال، اردو دنیا، تحریکِ ادب، عصری آگہی، نئی کتاب، روشنائی، جدید ادب، ارتباط، سلسلہ، سحاب، نظمِ نو، ادیب انٹرنیشنل، نایاب، عکاس، اخبارِ اردو، فکرِ نو، سخن شناس، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

س: اس ضمن میں آپ کی حوصلہ افزائی سب سے زیادہ کس نے کی ؟

ج: پاکستان میں ہماری نوعمری کے اکتسابی دور کا زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ جب تہذیبی وضعداری، اخلاقی اقدار کا راج اور اپنے چھوٹوں کی قدر، ہمت افزائی اور بے لوث تربیت کرنے کا رواج تھا۔ گروپ بندی اور مصلحت اندیشی نے جنم نہیں لیا تھا۔ لہٰذا ہمارے سب ہی علمی و ادبی سینئرس نے ہماری نگہداری کی کہ جن کے اگر نام گنوانا شروع کریں تو درجنوں نام سامنے آئیں گے۔ لہٰذا یوں سمجھ لیں کہ ہماری تخلیقی، تمثیلی اور مزاجی تربیت میں بالترتیب حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، زیڈ۔ اے بخاری صاحب اور فیض احمد فیضؔ صاحب عمل پیرار ہے۔

س: پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد آپ کے پر لگ گئے، بہ کثرت شاعرانہ کلام کی کثرت سے آپ کی شاعری کا معیار تو متاثر نہیں ہُوا؟

ج: وہ جو میرؔ صاحب کا شعر ہے نا۔۔

غزل کہنا نہیں آتی تھی، تو سَو شعر کہتے تھے
مگر اک شعر بھی اے میرؔ اب مشکل سے ہوتا ہے

ایسا ہوتا ہے کہ عمر بڑھنے اور وقت گزرنے کے ساتھ تخلیق کار میں خود احتسابی

بھی آ جاتی ہے۔ اور اسی ''خود احتسابی'' نے ہمارے شعری معیار کو کبھی نہیں گرنے دیا۔

س: جوشؔ صاحب نے تخلیقی تربیت میں کیا کردار ادا کیا؟

ج: جوشؔ صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے اردو زبان و بیان پر عبور حاصل کیا۔ کہ وہ ہماری عربی تعلیم کو بیحد قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''میاں! اپنی اردو نگارشات میں عربی اور فارسی کی ملمع کاری کیا کرو۔ سب سے الگ نظر و آ ؤ گے''۔ (ملمع کاری۔ جسے آج کل کی زبان میں ''تڑکا لگانا'' کہتے ہیں)۔ اُن دنوں ہائی اسکول کے طالب علم کو عربی یا فارسی لینا لازمی ہوتا تھا۔ اب چونکہ عربی تو ہماری ابتدائی تدریسی زبان تھی۔ لہٰذا ہم نے فارسی لی۔ اور پھر جوشؔ صاحب کی ہدایت پر کراچی میں ''فرہنگ خانۂ ایران'' میں شام کی فارسی کلاسیں بھی اٹینڈ کرنا شروع کر دیں۔ جس کی تکمیل پر ڈپلومہ پایا۔

س: آپ کی تمثیلی تربیت میں ریڈیو پاکستان کراچی کے اُس وقت کے سربراہ' زیڈ۔ اے بخاری صاحب نے کیا کردار ادا کیا؟

ج: آج کے زمانے میں ریڈیو ٹی وی اور اسٹیج پر اردو زبان اور کلام کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی اور زیڈ۔ اے بخاری صاحب موجود نہیں ہیں۔ ہم آپ کو بتائیں کہ بخاری صاحب کا تو یہ عالم تھا کہ کراچی اسٹیشن پر اُن کے آفس میں ہر وقت ریڈیو ON رہتا تھا' ان کے آفس سے متصل واش روم تک میں ہر وقت

ریڈیو چلتا رہتا تھا۔ اور جب وہ اپنے گھر پر ہوتے' تب وہ ریڈیو وہاں بھی ہر وقت سنتے رہتے۔ اور جہاں انہوں نے کسی آرٹسٹ کے منہ سے کسی لفظ کی غلط ادائیگی نوٹس کی۔ تو سمجھیں ایک بھونچال سا آ جاتا تھا۔ فوراً اُس پروگرام کے پروڈیوسر اور آرٹسٹ کی طلبی ہو جاتی۔ دونوں کی موجودگی میں اُس غلط ادا کئے ہوئے لفظ کے تلفظ اور اس جملے کی ادائیگی میں آواز کے اتار چڑھاؤ اور تاثر کے فقدان کی نشان دہی کی جاتی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے سامنے اس کی صحیح ادائیگی کروائی جاتی۔ لہٰذا اس غلطی کی پاداش میں جب کبھی ہمارے پروڈیوسر یاور مہدی صاحب کے ساتھ ہماری طلبی بھی ہو جاتی تو۔ اپنی نوعمری کی وجہ سے' ہم تو گویا کانپ جاتے۔ کہ غصے کی حالت میں بخاری صاحب کی گرجدار آواز ہمیں ہی کیا اچھے اچھوں کو سہما دیتی تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ایک مرتبہ اُس زمانے کے صفِ اوّل کے نیوز کاسٹر شکیل احمد صاحب سے خبروں کے دوران کسی لفظ کے تلفظ کی غلط ادائیگی ہو گئی تھی۔ تو بخاری صاحب دوڑتے ہوئے نیوز روم پہنچ گئے تھے۔ اور شکیل احمد صاحب کی کلاس وہیں شروع ہو گئی تھی۔ لہٰذا ہماری تمثیلی تربیت میں بخاری صاحب کے کردار کا اندازہ آپ کو ہو جانا چاہیئے۔

س: فیض صاحب نے آپ کی مزاجی تربیت کی اس کا آپ نے کیسے اور کیا اثر قبول کیا؟

ج: بیروت میں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۲ء تک فیض صاحب کی قربت کی ہر گھڑی میں ہم نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ جیسے تمام سکون اور اطمینان ان کے جسم و ذہن میں

سمٹ آیا ہے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنی اندرونی کیفیت کو اپنے چہرے پر نہیں ظاہر ہونے دیتے تھے۔ یہ فیضؔ کی سخت جانی اور ظرف کا کمال تھا کہ وہ چیخے نہیں، تڑپے نہیں۔ یہ میرا بیروت میں اُن کی چار سالہ رفاقت کا مشاہدہ ہے کہ فیضؔ صاحب بڑے ٹھنڈے میٹھے آدمی تھے۔ غصہ ان کو بالکل نہیں آتا تھا۔ کچھ بھی ہو۔ کسی نے انہیں غیظ میں نہیں دیکھا۔ یاروں نے کیسے تیران پر نہ چھوڑے۔ کس کس گالی سے ان کو نہیں نوازا۔ مگر یہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نہ گالی، نہ غصہ، نہ اشتعال۔ وہی محبت و مروّت میں لپٹی، انکسار و اختصار میں رنگی بے غرض و بے لوث مسکراہٹ ہر انسانی چہرے پر چھڑک رہے ہیں۔ اور جب ہم نے (۳۱) سال کی ناپختہ عمر میں پورے چار سال ایسی درویش صفت ہستی کے ساتھ گزارے تو ہمارے مزاج کا ان کے مزاج میں ڈھل جانا ایک فطری عمل ہے۔

س: آپ نے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کی خاردار وادی میں بھی تو طبع آزمائی کی تھی؟ آپ کس اخبار سے منسلک تھے؟

ج: ۱۹۶۷ء میں ہم نے محمد فائق مرزا صاحب کی نگرانی اور اپنی ادارت میں ''ویکلی کراچی'' جریدہ نکالنا شروع کیا۔ جس کی سرپرستی ابراہیم جلیس صاحب نے فرمائی۔

س: ادارت کا یہ تجربہ کامیاب رہا؟

ج: تجربہ کیا۔ یہ تو ہمارا شوق تھا۔ صحافت ہماری فیلڈ ہرگز نہ تھی کہ ہم تو اپنے والدین کی خواہش پر Aeronautical Engineering پڑھ

رہے تھے۔ جبکہ ہمارا مزاج تو لڑکپن سے شاعرانہ تھا۔ لہٰذا جب کراچی میں ہماری تعلیم مکمل ہوگئی اور ہم اپنے والدین کے پاس سعودی عرب سدھارے تو ''ویکلی کراچی'' بھی بند ہوگیا۔ اصل میں ہمارے والد صاحب ہر ماہ جدّہ سے ہمارے اخراجات کے لیے اتنا بھاری بھرکم منی آرڈر بھیج دیا کرتے تھے کہ اسے جائز طریقے پر پورا خرچ کرنا بھی ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ لہٰذا اپنے شوق کی تکمیل کے لیے کوئی جریدہ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جبکہ اُس رقم کے چیک جو ہمیں ریڈیو اور ٹی وی سے ملتے تھے۔ وہ سارے کے سارے ہم اپنے دوستوں کو ''ٹریٹ'' کرنے پر خرچ کردیتے تھے۔ البتہ ابراہیم جلیس صاحب کی سرپرستی اور فائق مرزا صاحب کی نگرانی میں ''ویکلی کراچی'' نکالنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہم نے ایک کامیاب علمی وادبی جریدہ نکالنے کی تربیت اور سلیقہ ضرور حاصل کرلیا۔ جو اب ''کراچی یونیورسٹی گریجویٹس فورم کینیڈا'' کا ششماہی ادبی مجلّہ ''الجامعہ'' ٹورونٹو میں پرنٹ کرکے کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں آباد جامعہ کراچی کے سیکڑوں فارغ التحصیل المنائز کو بھیجنے میں کام آرہا ہے۔

س: ویکلی کراچی کس مزاج کا جریدہ تھا؟

ج: وہ ایک علمی، ادبی، تعلیمی اور نیم سیاسی نوعیت کا 'نوجوانوں کا پرچہ تھا۔ جسے ابراہیم جلیس صاحب جیسے نامور ادیب اور کالم نگار کی سرپرستی حاصل تھی۔ کہ اُس دور کے دیگر نابغۂ روزگار بزرگ اہلِ قلم کی طرح وہ بھی اِس ناچیز کی بیحد قدر کیا کرتے تھے۔ جب ہمارا پہلا شعری مجموعہ چھپنے جارہا تھا تو ایک روز ہم ابراہیم جلیس صاحب کے پاس ان کے گھر پی آئی بی کالونی (ابراہیم مارکیٹ

کے پیچھے) اپنا اسکوٹر دوڑاتے پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہمیشہ کی طرح نہایت شفقت کے ساتھ مسکرائے اور گویا ہوئے۔ ''ہاں بھئی! ہم سے ملنے آئے ہو۔ یا اپنے دوست شہریآر کے ساتھ کسی مہم پہ جانا ہے!؟''۔ (شہریار جلیس نیشنل کالج کراچی میں ہمارے ہم سبق تھے۔ جواب امریکہ میں آباد ہیں)۔ ہم نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا کہ۔ جی انکل! اِس وقت ہم آپ ہی سے ملنے آئے ہیں۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ ہمارا پہلا شعری مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ اور ہماری خواہش پر' ہماری اوّلین کتاب کے لیے کچھ لکھنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ فرمایا کل آ کر لے جانا۔ اور دوسرے دن جب ہم گئے تو ان کا لکھا تیار تھا۔ جس کی آخری سطور یہ ہیں۔ ''تسلیم الٰہی زلفی صاحب ہمارے نوعمر اور نوجوان شاعروں میں بڑے قادرالکلام شاعر ہیں' اردو شاعری کا شاندار مستقبل زلفی صاحب کا منتظر ہے''۔

س: کینیڈا سے آپ کی ادارت میں کون سا ششماہی مجلّہ شائع ہوتا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے؟

ج: جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ وطن اور اہلِ وطن سے دوری کے احساس کو قدرے کم کرنے اور کسی طور رابطے میں رہنے کے لیے۔ ہم نے یہاں University of Karachi Graduates Forum Canada ''جامعہ کراچی فارغ التحصیل المنائی فورم کینیڈا'' قائم کیا ہوا ہے۔ جس کے بینر تلے ہر دوسرے تیسرے مہینے یا تو مقامی (شمالی امریکہ اور یورپ کے) اہلِ قلم کو جمع کر کے مشاعرہ' سیمنار' کانفرنس' علمی لیکچر' کتابوں کا

اجراء اور ادبی ریفرنس وغیرہ کرتے رہے ہیں۔ یا پھر ہر سال پاکستان سے دو ایک رائٹرز کو "وزٹ ویزہ" پر بلا کر کوئی "انٹرنیشنل" ٹائپ تقریب کا اہتمام کر لیتے ہیں۔ اور اپنی ان تمام سرگرمیوں اور اپنے پانچ سو ممبران کے کوائف کو "ممبر ڈائریکٹری" کی شکل میں منصۂ شہود پر لانے اور ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کے لیے۔ ہم اپنی ادارت میں ایک ششماہی ادبی مجلّہ "الجامعہ" ٹورانٹو میں ہی چھپوا کر دنیا بھر میں مفت تقسیم کرتے ہیں۔ اِس مجلّے میں جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلے تو ہماری تقریبات کی رپورٹس اور تصویریں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کہانیاں' افسانے' علمی و تہذیبی مضامین' شاعری اور آخری سولہ صفحات میں جامعہ کراچی یا اس سے منسلک کسی بھی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل خواتین و حضرات کے کوائف کی ڈائریکٹری ہوتی ہے' جس کے ذریعے کینیڈا' امریکہ اور یورپ میں آباد تمام لوگ اپنے اپنے زمانے کے ہم سبق دوستوں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فنکشن میں شرکت کے لیے مغربی دنیا میں آباد لوگ اپنے دوستوں سے Re-Union کرنے کے لیے نہایت جوش و خروش کے ساتھ آتے ہیں۔

س: ربع صدی سے آپ کینیڈا کے اخبارات میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں' آپ کا یہ سفر اظہارِ رائے کی آزادی کے ساتھ جاری ہے یا آزادی و پابندی کے بین بین کالم نگاری کرتے ہیں۔؟

ج: یہاں مغربی دنیا میں تقریر و تحریر پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ سوائے اس احتیاط کے کہ اس سے کسی فرقے کی دل آزاری نہ ہو یا کسی کو کسی قسم کا بے جا

نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اور جہاں تک ہمارے کالموں کے موضوعات کا تعلق ہے تو ہم بالعموم' شہری' سماجی' ثقافتی' فنی' طبی' اصلاحی اور نیم سیاسی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ بالخصوص طور پر دوسرے ممالک سے "نوواردان" کو یہاں کے قوانین' نظامِ زندگی' زبان' معاشرتی طور طریقے' تہذیب و ثقافت اور معاشی حصول سے آگاہی اپنے ان کالموں کے ذریعے فراہم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں ہجرت کر کے آنے والے امیگرینٹس میں ہمارے کالم بیحد مقبول ہیں!۔ ساؤتھ ایشین کمیونٹی کی ان ہی خدمات کے اعتراف میں گورنمنٹ آف کینیڈا ہمیں اکثر اعترافی اسناد اور حُسنِ کارکردگی کے ایوارڈز سے نوازتی رہتی ہے۔

س: آپ اپنی نوجوانی ہی سے دنیا کے بھی اہم اور بڑے ممالک کی سیاحت پر جاتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ نے کوئی سفرنامہ لکھنے کے بجائے "آگرہ سے نیاگرہ" کے عنوان سے مختصر سیاحی نظمیں لکھیں۔ آخر کیوں!؟

ج: دیکھیں۔ سفرنامے تو سب ہی لکھتے ہیں' کوئی کسی ایک ملک کی سیاحت بھی کر لے تو فوراً سفرنامہ لکھ دیتا ہے۔ بعض لوگ سفر ہی سفرنامہ لکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہی سفرنامہ لکھ مارتے ہیں۔ تو کچھ اپنے سفرنامے کا آغاز ہی اس جملے سے کرتے ہیں کہ۔ جیسے ہی مجھ رومن شہزادے نے ائرپورٹ کے Arrival پر قدم رکھا۔ اُس شہر کی درجنوں دوشیزاؤں نے پھولوں کے ہار میرے گلے میں ڈال دیئے۔ اور کئی تو خود ہی ہمارے گلے کا ہار بن گئیں !!۔ اور لوگ ہیں کہ چٹخارے لے لے کر

ایسے سفرنامے پڑھتے بھی ہیں۔!!اب بھلا ہم تو ایسے مسالے دار سفرنامے لکھنے سے رہے۔لہٰذا ہم نے یہ طے کیا کہ کیوں نا سب سے الگ کام کریں۔ ویسے بھی آج کے اس مصروف دور میں سنجیدہ اور باذوق لوگوں کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں کہ سیکڑوں صفحات کے خیالی سفرنامے پڑھیں۔اسی لیے ہم نے دنیا کے پچیس بڑے ممالک کے ان اہم شہروں جہاں اپنی منصبی ذمے داریوں کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء کے اوائل سے ہمارا مستقل آنا جانا رہتا ہے'اور ہم نے وہاں کے تاریخی' ثقافتی' سماجی' علمی' ادبی' سیاسی اور فنی مظاہر کا اپنے زاویۂ نگاہ سے جائزہ لے کر مختصر مگر جامع ''سیاحی نظمیں'' لکھیں اور انہیں ''آگرہ سے نیاگرہ'' کے نام سے کتابی شکل میں منصۂ شہود پر لائے۔جنہیں دنیائے ادب کے اہلِ نقد ونظر کے علاوہ عام باذوق افراد نے نہایت پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

س: کالج داخلے کے بعد کالج و یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے نشر ہونے والے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ طلباء وطالبات کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے والے ریڈیو پاکستان کراچی کے مقبول پروگرام ''بزم طلباء'' میں پہلی بار شرکت کیسے ہوئی؟

ج: اپنے کالج کے زمانے میں ہم نے ریڈیو پاکستان کراچی سے تعلیمی پروگراموں کی میزبانی شروع کی۔۱۹۶۲ء میں جب ہمارے پروڈیوسر عالمی شہرت یافتہ مصور اور رسام صادقین صاحب کو پیرس کے ''لور عجائب گھر'' (جہاں مونالزا کی تصویر آویزاں ہے) کی تزئین و آرائش کے لیے فرانس بلایا گیا تو ان کی جگہ

یاور مہدی صاحب کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اس طرح ریڈیو پاکستان کراچی سے اُن کی نگرانی میں ''بزمِ طلباء'' اور ''یونیورسٹی میگزین'' کی میزبانی ہم نے انجام دی اور جب ۱۹۶۶ء میں کراچی سے PTV کی نشریات کا آغاز ہوا تو چونکہ اُس وقت کسی کے پاس ٹی وی کے کام تجربہ نہیں تھا۔ لہٰذا ریڈیو سے ہم ریڈیو کے آرٹسٹوں کو اپنے اپنے شعبے کے پروگرام کرنے کے لیے ٹی وی بلا لیا گیا۔ اس طرح مجھے اور عبید اللہ علیم کو تعلیمی اور ادبی پروگرام ہوسٹ کرنے کے لیے طارق عزیز صاحب (جو اُن دنوں ٹی وی پر خبریں بھی پڑھتے تھے) کے سپرد کر دیا گیا۔ یاد رہے کہ کراچی میں PTV کی نشریات کا یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ ٹی وی اسٹیشن کی عمارت ابھی پورے طور پر مکمل بھی نہیں ہوئی تھی اور ہم لوگ شامیانوں اور قناتوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے پروگرام کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں شام کے وقت محض چند گھنٹوں کی Live نشریات ہوتی تھیں۔ یعنی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ اور یہ شاید تب ہی کی تربیت اور مشق کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ٹورونٹو میں اپنے تمام ٹی وی شوز اور انٹرویوز بغیر کسی اسکرپٹ اور سوالات کی پیشگی تیاری کے Extempore کرتے ہیں۔ ارے بھئی یہ تو شوز کی بات ہے۔ ہم تو خبریں بھی محض ''سرخی'' پر نظر ڈال کر Extempore سناتے ہیں۔

س: ریڈیو پر تمام تر اہمیت اور زور صوتی تاثرات پر ہوتا ہے۔ ٹی وی پر آپ کے ادا کیئے جانے والے مکالموں کے تاثرات چہرے اور حرکات و سکنات سے عیاں ہوتے ہیں۔ یہ یکسر مختلف تجربہ تھا اور ستم بالائے ستم پہلا پروگرام ہی

لائیو۔ کیسے نبرد آزما ہوئے؟

ج: نبرد آزما۔ کیا ہوتا تھا۔ ہم تو اپنے ریڈیو کے پروگرام کرنے کے لیے بھی خوب سج بن کے اور پرفیوم میں نہا کر مائیک کے آگے ایسے بیٹھا کرتے کہ جیسے ہمارے سامعین ہمارے سامنے براجمان ہیں۔ اور ہم اپنے ہاتھ نچا نچا کر پورے Eye Contact کے ساتھ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ (اس بات کی گواہی ہمارے سینئر قاضی واجد صاحب بھی دیں گے)۔ لہٰذا ٹی وی پر پہلا لائیو پروگرام کرتے ہوئے کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا گھبراہٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ پہلے پروگرام کے بعد ہی ہمیں ٹی وی پر تعلیمی پروگراموں کا میزبان بنا دیا گیا تھا۔

س: آپ کے خیال میں عمدہ کمپیئرنگ کی بنیادی شرائط کیا ہیں؟ ریڈیو ٹی وی اور اسٹیج کی کمپیئرنگ میں کیا فرق ہے؟

ج: عمدہ کمپیئرنگ کی بھی وہی شرائط ہیں جن کا اطلاق ایک عمدہ مقرر پر بھی ہوتا ہے۔ یعنی زبان و بیان پر قدرت۔ جسے عرفِ عام میں ''قادرالکلامی'' کہا جاتا ہے۔ اور قادرالکلامی' ہر موضوع پر مطالعے اور اپنے دماغ میں ہر نوعیت کی معلومات سجانے سے آتی ہے۔ آپ یہ کبھی نہ سوچیں کہ بھلا اس بات سے میرا کیا تعلق۔ مجھے کیا ضرورت ہے اِس اِبتلا کو اپنا موضوعِ سخن بنانے کی۔ بھلا Gay & Lesbian سے مجھے کیا دلچسپی!!۔ لیکن یہاں تعلق اور دلچسپی کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ''ضرورت'' کی ہے۔ واضح رہے کہ کسی بھی نوعیت کی آگاہی کو محض ذہن نشیں کر لینا یا رَٹ لینا ہی کافی نہیں۔ اُس کے مختلف

پہلوؤں پر غور وفکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے کہے کی مثال اِس انٹرویو ہی کو بنایا جاسکتا ہے۔ کہ آپ نے پہلے ہمارے متعدد انٹرویوز پڑھے۔ اُن پر غور وفکر کیا۔ تب ہی تو اِن ضمنی سوالات نے جنم لیا۔ جو آخرِ کار ایک اور انٹرویو کی شکل اختیار کر گئے !۔ میرے نزدیک ریڈیو ٹی وی یا اسٹیج کی کمپئرنگ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کمپئر' کمپئر ہوتا ہے۔ خوش شکلی' خوش لباسی' گہرا میک اپ یا اداکاری۔ انسان کو قادرالکلام نہیں بنا سکتی۔ اور تینوں شعبوں کی بنیادی ضرورت ''قادرالکلامی'' ہے۔

س: پہلا ٹی وی پروگرام کس نوعیت کا تھا؟

ج: کراچی ٹیلی وژن کی نشریات شروع ہونے کے بعد کے دوسرے دن ہم نے جس پروگرام سے اپنی شمولیت کا آغاز کیا' وہ نوجوانوں کے لیے ایک علمی' ادبی' تعلیمی اور معلوماتِ عامہ کا تجرباتی لائیو شو تھا۔ جس کے پروڈیوسر (نیلام گھر والے) طارق عزیز صاحب تھے جبکہ اس پروگرام کی صدارت رئیس امروہوی صاحب نے فرمائی۔ اب چونکہ ہم حسب دستور گفتگو اور سوالوں کے صحیح جواب دینے میں سب سے آگے رہے تو ظاہر ہے انعام میں کتابیں بھی ہمیں ہی سب سے زیادہ ملیں۔ لیکن جب پروگرام کا اختتام ہوا تو پروگرام کے دیگر شرکاء میں سے عبیداللہ علیم اور نصیر ترابی (جو ہم سے چار سال سینئر تھے) ہماری کتابوں پر جھپٹ پڑے اور ہم سے کچھ کتابیں چھین کر شامیانے سے باہر دوڑ گئے، لہٰذا ہم نے بھی اپنی بچی کھچی کتابیں رئیس امروہوی صاحب کی گود میں ڈالیں اور اُن دونوں کے پیچھے دوڑ لگائی۔ لیکن وہ

دونوں ہمارے ہاتھ نہ آئے۔ اور نہ ہی کبھی ہماری کتابیں واپس ملیں!۔ خیر اُس کے بعد کے ابتدائی دنوں کی کہانی بھی بیحد دلچسپ ہے۔ ٹی وی پر ہفتہ وار تعلیمی پروگراموں کی میزبانی کے لیے جب ہمارا انتخاب ہوگیا تو ہم نے اپنے گھر والوں کو بتایا۔ اُس زمانے کے مہذب گھرانوں میں، فلموں، اسٹیج اور ٹی وی پر کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا جب ہماری دادی جان نے یہ بات سنی تو بہت ناراض ہوئیں کہ۔ یہ تم کیا کر رہے ہو!۔ تمہارے ماں باپ نے تمہیں یہاں میری اور تمہارے دادا کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جدّہ سے کراچی بھیجا ہے۔ اور تم ٹی وی پر ناچنے گانے والوں میں شامل ہونے کی اجازت مانگ رہے ہو!!۔ ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ دادی جان! ہم ٹی وی پر ناچ گانا ہرگز نہیں کریں گے۔ ہم تو ریڈیو کی طرح اپنے تعلیمی پروگرام ہی کریں گے۔ لیکن انہوں نے صاف منع کر دیا۔ اور فرمایا کہ تم اس کام کی اجازت اپنے باپ کو خط لکھ کر حاصل کرو۔ اب خط لکھ کر اجازت حاصل کرنے میں دو ہفتے لگ جاتے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہمارے والد صاحب اپنی والدہ صاحبہ سے اختلاف کرتے ہوئے ہمیں اجازت دے دیتے۔ لہٰذا ہم نے اپنا یہ مسئلہ طارق عزیز صاحب کے سامنے رکھا۔ اور انہیں ہمارے گھر آ کر دادی جان کو راضی کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ خیر وہ دوسرے دن ٹی وی نشریات کے اختتام پر ہمارے گھر آئے۔ دادی جان انہیں ٹی وی پر خبریں پڑھتے دیکھتی تھیں، لہٰذا فوراً پہچان گئیں۔ لیکن جب کسی نے ان کے کان میں بتایا کہ طارق عزیز فلموں میں بھی کام کرتے ہیں۔

تو وہ ایکدم اُکھڑ گئیں اور فرمایا۔ طارق میاں! ہمارے پوتے کو معاف کرو۔ یہ یہاں اپنی تعلیم مکمل کرنے آئے ہیں۔ نہ کہ ناچ گانے کا کام کرنے۔ قصہ کوتاہ۔ طارق عزیز نے کس مشکل سے دادی جان کو قائل کیا وہ ہم جانتے ہیں۔ جس کے لیے ہم ہمیشہ ان کے ممنون رہیں گے۔

س: جامعہ کراچی اور بزمِ طلباء کے زمانے میں اپنی کچھ غیر نصابی اور ''معرکۃ الآراء'' سرگرمیوں کے بارے میں بتائیے؟

ج: دیکھیں اب اِس عمر میں اپنے منہ سے۔ اپنے تعلیمی اور نشر و اشاعتی دور کی غیر نصابی اور ''معرکۃ الآراء'' سرگرمیوں کا حال سناتے کیا اچھے لگیں گے۔ لہٰذا یوں کرتے ہیں کہ یہاں ہم یونیورسٹی میں اپنے سینئر ساتھی اور ریڈیو پر بزمِ طلباء کے لائیو مباحثہ میں (جس کے ماڈریٹر کے فرائض ہم ہی انجام دے رہے تھے)۔ ''ایوب خان مردہ باد'' کا نعرہ لگانے والے۔ جوشیلے نوجوان انقلابی شاعر اور مقرّر یونس شرؔر کے ایک شرارتی طویل مضمون (جو ہمارے فورم کے میگزین کی جنوری ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں شامل ہے) کا ایک اقتباس آپ کو سنائے دیتے ہیں:

''یونیورسٹی میں بین الکلیاتی مشاعرے، مباحثے اور موسیقی کے پروگراموں کے موقع پر جامعہ کراچی ''بزمِ ادب'' کے جنرل سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے تسلیم الٰہی زلفی کی مصروفیات اس قدر بڑھ جاتی تھیں کہ انہیں سر اٹھانے کی فرصت نہیں مِلتی، پنکی اور نمکی کا بصد احترام استقبال کرتے، گائیڈ کے فرائض انجام دیتے، جب تک مناسب نشستوں کا انتظام نہ ہو جاتا، وہاں سے نہ ہلتے،

پھر نئے آنے والے مہمانوں کی تیاری میں لگ جاتے۔ ساری شرافت اور خاندانی رکھ رکھاؤ اس فراخدلی سے اپنے مہمانوں پر خرچ کرتے کہ دوستوں کے لیے باقی کچھ نہ بچتا۔ جون ایلیاء اور عبید اللہ علیم اگر مشاعرے کے جج ہوتے تو یہ اس قدر چوڑ جاتے کہ سارے گھوڑے گھانس کھاتے رہ جاتے۔ اگر غزل پر بات چھڑ جاتی تو قریب سے گزرتے ہوئے اظہر عباس ہاشمی ریشۂ خطمی ہوجاتے۔ بین الکلیاتی ''ہفتۂ طلباء'' کا آغاز کراچی کے تمام کالجوں اور یونیورسٹی میں ایک ساتھ ہوتا' اُس موسم میں تسلیم الٰہی زلفی کے رابطوں کا سلسلہ کراچی کی معروف شخصیات' شعراء اور ادباء کے ساتھ شدّت اختیار کر جاتا' خاص طور پر اُن لوگوں کے ساتھ جو مشاعروں میں منصفین کے فرائض ادا کر رہے ہوتے یا صدارت۔ کراچی یونیورسٹی میں طرحی مشاعرے کا اعلان ہوا' یونین کی جانب سے مشاعرے کے لیے انتظامی امور اور کراچی کے کالجوں سے رابطے کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی' مشاعرے منصفین اور صدارت کے لیے نام تجویز ہو گئے۔ ایک دن ہم جناب رئیس امروہوی کے گھر گئے تا کہ منصفِ اعلیٰ کے لیے ان کی رضامندی حاصل کرلی جائے' ہم نے مصرع بتایا۔ رئیس امروہوی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا' یہ پندرھویں غزل ہے جو تمہارے آنے سے پہلے کہی ہے' کل پانچ غزلیں تسلیم الٰہی زلفی لکھوا کر لے گئے ہیں' کہہ رہے تھے گرلز کالجوں کی طالبات کے لیے لے جا رہا ہوں۔ اب تم بتاؤں منصف کی حیثیت سے اپنی کس غزل کو انعام دوں!۔ ہم نے فوراً رئیس امروہوی صاحب کو منصف کے بجائے صدارت

کے لیے تیار کر لیا اور منصفین کے تمام نام تبدیل کر دیئے انہیں مشاعرہ شروع ہونے کے آخری لمحہ تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ جناب تابش دہلوی، پروفیسر وحیدہ نسیم اور اپنے استادِ محترم جمیل اختر خاں کو منصفین کی نئی فہرست میں شامل کیا گیا' مشاعرے کی صدارت اور منصفین کے ناموں کا اعلان ہوتے ہی زلفی جی پچھاڑیں کھانے لگے۔ اب تک جو لہکتے اور مہکتے پھر رہے تھے' دھپ سے بیٹھ گئے۔ رات بھر یہ بڑے اشتیاق کے عالم میں ستاروں کی با قاعدہ تنظیم میں مصروف رہے تھے' گردشی نشانِ ظفر (ٹرافی) سے لے کر اوّل' دوم' سوم اور چہارم انعام کو اپنے انداز میں ترتیب دے چکے تھے' کامیابی کی سو فیصد امید میں زہرہ و مشتری' کہکشاں سے برجِ ثریا کا طواف کرنے کے بعد ہال میں پہنچے تھے' نہایت احتیاط کے ساتھ گھر گھر رئیس صاحب کی غزلیں تقسیم کی جاتی تھیں۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یاور مہدی بھی ان معرکوں میں شریک ہوتے تھے!۔ تابش دہلوی اور پروفیسر جمیل اختر خاں سے زلفی کی کھسر پھسر سے ہم نے اندازہ لگا لیا تھا' وحیدہ نسیم صاحبہ کے قریب جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی' نتائج کو آخری لمحوں میں تبدیل کرانے میں یاور مہدی کو بڑی مہارت حاصل تھی' چاہے منصفین کی صف میں پروفیسر کرار حسین بیٹھے ہوں' مجتبیٰ حسین ہوں' ابراہیم جلیس یا سید محمد تقی ہوں' لیکن ہم نے ان کی بساط الٹ دی تھی۔ اس مشاعرے کے فیصلے اور نتائج نے یاور مہدی کے کان کھڑے کر دیئے تھے۔ ہم تو پہلے ہی سے اُن کے لیے خطرے کی گھنٹی تھے' مگر اب زلفی کے میدان میں اترنے سے وہ پریشان نظر آنے لگے تھے"۔

یہاں ہم آپ سے ایک وضاحت کرتے چلیں کہ ہم' یونس شرر' یا' یاور مہدی یا دوسرے لڑکے' لڑکیاں جو یہ شرارتیں کرتے اور معرکے سر کرتے تھے وہ کسی کے دباؤ' یا سازش کے تحت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ محض طالب علمی کے دور کے شغل و شرارت کے طور پر کرتے تھے۔ اور کامیابی یا ناکامی کی صورت میں خوب ہنستے بھی تھے اور ایک دوسرے کا مذاق بھی بناتے تھے۔ کہ ہمارا مقصد محض اپنے گروپ کے لڑکے لڑکیوں کو نمایاں کرنا۔ اور اپنے تعلیمی ادارے کو ٹرافی' شیلڈ یا پہلی پوزیشن دلوانا ہوتا تھا۔ اور یہ بات اُس زمانے کے ہمارے سینئرس کو بھی معلوم تھی۔ تب ہی تو اکثر وہ ہمارے ان معرکوں اور شرارتوں میں شریک بھی ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جن طالبات کو ہم شغل کے طور پر غزلیں ''سپلائی'' کیا کرتے تھے اور انعامات دلوایا کرتے تھے۔ مستقبل میں ان میں سے کوئی بھی شاعرہ کی حیثیت سے منظرِ عام پر نہیں آئی۔ ارے وہ زمانہ ہی اور تھا۔ جب دلوں میں محبتیں تھیں۔ باہمی قدر و عزت تھی۔ سینئرس کا احترام تھا۔ تمام طالب علموں کی زندگی ہر طرح کے رنج' غم' پریشانی' ڈر' خوف یا کسی تخریبی کاروائی یا گروہ بندی سے دور تھی۔

س: آپ کے زمانۂ طالب علمی میں معاشی خوشحالی تھی' بے فکری بھی اور والدین سعودی عرب میں۔ ایسی صورتحال میں عموماً آپ کی عمر کے نوجوان راہ سے بھٹک جاتے ہیں' اور کچھ مفاد پرست لوگ بھی بھٹکا دیتے ہیں۔ آپ نے کیسے خود کو محفوظ رکھا؟

س: دیکھیں یہ سب انسان کے مزاج اور فطرت کا کھیل ہے۔ جسے بھٹکنا ہوتا ہے وہ

دس پہروں اور غربت میں بھی بھٹک جاتا ہے۔ والد صاحب ہر ماہ میرے اخراجات کے لیے ایک Handsome Amount بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں اُس زمانے کے لحاظ سے ریڈیو اور ٹی وی سے بھی ہر ہفتے ایک خاطر خواہ رقم کا چیک مل جایا کرتا تھا۔ لہٰذا ہم کرتے یہ تھے کہ اپنے تعلیمی اخراجات، تعلیمی ادارے کی فیس، کاپی کتابوں کی خریداری، فیشن کے کپڑوں کی سلائی، ادبی کتابوں رسالوں کی خریداری اور دوستوں کے چائے پانی پر خرچے کے بعد جتنے بھی پیسے بچتے ہم خاموشی سے اپنے سفید پوش ضرورت مند دوستوں پر خرچ کر دیتے۔ اور ظاہر ہے نہ انسان کے پاس فالتوں پیسے ہوں گے اور نہ وہ مفاد پرست لوگوں یا عیاشیوں کا شکار بنے۔

س: اپنے طالب علمی کے زمانے میں کسی بزرگ شاعر کے ساتھ پیش آنے والا کوء دلچسپ واقعہ یاد ہے؟

ج: جی ایسے دلچسپ واقعات تو ہر روز ہی پیش آتے رہتے تھے۔ کراچی میں اپنی تعلیمی، علمی، ادبی اور نشر و اشاعتی سرگرمیوں کے ناتے میرا اُس دور کے تمام شعراء و ادباء سے براہِ راست تعلق رہا۔ جن میں استاد قمر جلالوی صاحب سے تو گویا ایک تعلقِ خاطر تھا۔ اُن کی محبتیں، شفقتیں اور نگہداریاں میرے لیے باعثِ فخر بنیں۔ اب مہینہ تو ہمیں یاد نہیں البتہ یہ ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے، اور یہ وہی زمانہ ہے جب صدر ایوب خان صاحب نے ایک جلسے میں استاد قمر جلالوی کو 500 روپے نقد کا ایوارڈ پیش کیا تھا۔ ہوا یوں کہ ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن پر ایک مشاعرہ کرنے کا پروگرام بنا، جس کے پروڈیوسر رضی

اختر شوق صاحب تھے۔اب چونکہ ہم بھی ریڈیو پر ''بزمِ طلباء'' پروگرام سے منسلک تھے اور کراچی کے تمام شعراء سے براہِ راست رابطے میں رہتے تھے۔لہٰذا شوق صاحب نے تمام مدعو شعراء کرام تک دعوت نامہ پہنچانے کی ذمے داری ہمیں سونپ دی۔لہٰذا ہم نے دوسرے شعراء کے ساتھ ساتھ استاد قمر جلالوی کو بھی دعوت نامہ پہنچا دیا۔خیر پروگرام کے مطابق ریڈیو پر شاندار مشاعرہ بھی ہو گیا۔جس کے بعد تمام شعراء کے نذرانے کے چیک بھی شوق صاحب نے ہمارے حوالے کر دیئے۔کہ بھئی یہ کام بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔اس طرح استاد کا چیک بھی ہم نے انہیں پہنچا دیا۔اس کام کے چند روز بعد استاد کے علاقے سے ہمارا گزر ہوا تو ہم نے سوچا کہ چلو ان سے بھی سلام دعا کرتے چلیں۔لہٰذا ہم نے اپنے اسکوٹر کا رخ اُدھر کی جانب کیا۔استاد نے ہمیں دیکھتے ہی تیزی سے اپنی بغل کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریڈیو سے ملنے والے چیک کا لفافہ نکالا اور ہمارے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے۔''میاں! آپ کے راج میں ہمارے ساتھ زیادتی ہوگئی''۔کیا ہوا استاد! ہم نے حیرت سے پوچھا۔کہنے لگے۔''میاں! تابش دہلوی مجھ سے عمر میں بھی چھوٹے ہیں اور شاعری میں بھی کم ہیں۔لیکن آپ کے ریڈیو والوں نے مجھے 32 روپے کا چیک بھیجا ہے۔جبکہ تابش کو 37 روپے کا۔شاید اُن کی ریڈیو کی ملازمت کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔آپ یہ چیک انہیں شکریئے کے ساتھ واپس کر دیں''۔استاد کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے ہم نے ہنستے ہوئے کہا۔نہیں ایسا نہیں ہے۔ریڈیو کے ملازم تابش دہلوی صاحب

نہیں بلکہ مسعود تابش صاحب ہیں (یاد رہے تابشؔ دہلوی صاحب اُس زمانے میں ''مسعود تابش'' کے نام سے ریڈیو پر خبریں پڑھا کرتے تھے) یقیناً غلطی سے انہیں 37 روپے کا چیک اشیو کردیا گیا ہوگا۔ ورنہ سب ہی کو 32 روپے کا چیک دیا گیا ہے۔ لیکن استادؔ ہماری یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ لہٰذا ہم نے ان سے وہ چیک واپس لے لیا' اور دوسرے دن اپنی تعلیمی مصروفیت کے بعد حسب معمول جب ریڈیو گئے تو وہ چیک شوقؔ صاحب کو لوٹا کر تمام صورتِ حال ان کے گوش گزار کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یقیناً اس معاملے میں تابشؔ صاحب نے شرارتاً استادؔ سے ایسا کہا ہوگا'۔ ہم نے عرض کیا۔ شوقؔ صاحب! استاد بیحد ناراض ہیں۔ وہ بولے ''بھئی اب میں استاد کے نام کا 37 روپے کا چیک تو نہیں بنوا سکتا۔ ورنہ دوسرے شعراء کو میں کیا سمجھاؤں گا''۔ ہم نے کہا۔ آپ ایسا کریں مجھے اِس چیک کے بدلے 32 روپے کیش دِلوادیں۔ باقی کام میں سنبھال لوں گا۔ لہٰذا انہوں نے 32 روپے ہمیں دلوا دیئے۔ دوسرے دن ہم استاد کے پاس گئے اور پورے 37 روپے ان کے ہاتھ میں رکھے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ ''بھئی لگتا ہے ریڈیو والوں نے واقعی اب پیسے بڑھا دیئے ہیں اور 32 کی بجائے 37 روپے کردیئے ہیں''۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ باقی کے پانچ روپے ہم نے اپنی جیب سے دیئے ہیں!۔

☆☆☆

# تسلیم الٰہی زلفی کے منتخب اشعار

انتخاب: سلطانہ مہر (برمنگھم۔ انگلینڈ)

(تسلیم الٰہی زلفی کے چار شعری مجموعوں "شہرِ افکار" ۱۹۶۷ء۔ "دستاویز" ۱۹۸۴ء "تنہا پرندے کی اُڑان" ۱۹۹۰ء۔ اور "یہ عشق بھی عجیب ہے ۲۰۱۲ء سے انتخاب)

## "شہرِ افکار" ۱۹۶۷ء سے انتخاب

یہ روز و شب جو گزرتے ہیں بِن ترے اے دوست!
جو تیرے ساتھ گزرتے ' تو کتنا اچھا تھا

آ مِل کے گلے کوچۂ ہستی سے نکل جائیں
اِس راہ میں سنسار کی دیوار نہیں ہے

وہ میرا ساتھ نبھاتا' مگر بھلا کب تک
سَراب دیکھ کے جینے کا حوصلہ کب تک!

یہ کون رات گئے یاد آ رہا ہے مجھے
مرے وجود کا شعلہ جلا رہا ہے مجھے

ترے بغیر کسی چیز کی کمی تو نہیں
یہ اور بات طبیعت اُداس رہتی ہے

مرے وجود کے جوہر کسی پہ کیا کُھلتے
ہر ایک شخص نے تنقید کی نظر ڈالی

وہ موم بنکے رہا ' اور پگھل گیا آخر
میں سخت جان تھا ' پتّھر میں ڈھل گیا آخر

تم کہ دو دن کے لیے ہو مری تنہائی میں
ایسا مِلنا تو مجھے اور بھی تنہا کرجائے

تم کہاں تک عنایات فرماؤ گے
میری محرومیوں کا ٹھکانہ نہیں

مجھ سے اتنا نہ مِلو ' دل ہی تمہارا بھر جائے
دُور اتنا بھی نہ جاؤ ' کہ کوئی مرجائے

مرے وجود کے محور کے گِرد آ جاؤ !
خلا میں یونہی بھٹکنے سے ' کھو نہ جاؤ گے

میں تا حیات کسی سے نہ ہوسکا منسوب
لکھے گئے مرے ماتھے پہ انتساب ایسے

## تسلیم الٰہی زلفی کے یہاں ''روشنی'' کا استعارہ

یوں دیا گھر میں جلانا چاہیئے
روشنی باہر بھی جانا چاہیئے

دیا روشن کروں لفظوں کا' اُس کے رُوبرو رکھوں
ارادہ ہے کسی دن میں بھی اُس سے گفتگو رکھوں

تعارف روشنی سے ہوگیا' دیوں کی بستی میں
وگرنہ ہم تو نکلے تھے' ہَوا سے دوستی کرنے

میں کب سے جل رہا تھا' قناعت کے طاق میں
سرکش ہوا نے چھیڑ کے' سورج کیا مجھے

اُتر آئیں گے دل میں چاند کتنے
صدا جب تیرگی دینے لگے گی

دیے میں ڈھل گئی تو دیکھ لینا
یہ مٹی روشنی دینے لگے گی

نہ جانے کس گھڑی، کس رات کو، وہ چھم سے آ جائے
سو گھر میں بوریا اور اہتمامِ روشنی رکھنا

چراغ جلنے لگے روح کے دریچوں میں
جب اپنا نام لکھا میں نے اُس کے ماتھے پر

کون سنبھال کے رکھے گا یہ روشنیاں
کون سنبھالے گا میرے فن پاروں کو

سرِ بام کوئی دیا جلا، وہ یقین کا ہو یا خواب کا
مری سوچ کو کوئی نام دے، مجھے الجھنوں سے نکال بھی

لبوں کا جب نشاں ماتھے پہ لو دینے لگے، اُس دم
اجالا ہی اجالا زندگی کے ہر سفر میں ہے

جس نے گوندھا تھا ازل میں مری مٹی کا خمیر
میں اُسی حُسن کے انوار سے رخشندہ ہوں

دماغ کے لیے سینے میں آگہی دیدی
چراغ کے لیے مٹھی میں روشنی دیدی

زمیں کے بعداندھیروں کا اک سفرؔ اور میں
پھر اُس کے بعد منوّر تھی رہگذر اور میں

لوگ خود کو جلائے رکھتے ہیں
جن گھروں میں دیئے نہیں ہوتے

ہم منڈیروں پہ جہاں روشن دیا رکھتے رہے
لوگ اس کے ساتھ فرمانِ ہوا رکھتے رہے

رات جس راہ سے آتی ہے وہیں دھیان ترا
اک دیا روز سرِ راہ جلا دیتا ہے

تم اپنی روشنی محفوظ رکھنا
تمہارے واسطے میں بجھ رہا ہوں

میرے چاروں طرف اُجالا ہے
روشنی آرہی ہے اندر سے

جو میں نے گھر بنایا تھا' میرا کہاں ہوا
تنکے کہاں رکھے تھے ' بسیرا کہاں ہوا

میں اپنے سر کو چھپاؤں ' تو پاؤں کھلتے ہیں
دیا منڈیر پہ رکھوں تو' گھر اندھیرا ہے

پرند کیوں نہ اُڑیں اُس درخت سے زخمی
کمان بن گئیں شاخیں' جہاں بسیرا ہے

پر دیئے ہیں تو پھر اُڑان بھی دے
میرے حصّے کا آسمان بھی دے

محبت زندگی مانگے گی پہلے
بالآخر زندگی دینے لگے گی

احباب کے خیال سے ' بولا جو پہلا جھوٹ
پھر دل سے اِس زباں کا تعلق نہیں رہا

ہونٹوں پہ مرے حرفِ دعا ٹوٹ گئے تھے
سو آج میں یہ دستِ دعا کاٹ رہا ہوں

آواز کوئی اب نہ کبھی دے مجھے زلفی
میں اپنی سماعت سے صدا کاٹ رہا ہوں

ہم نے اپنا گھر سرائے کردیا
پیڑ کیا بیٹھے گا اپنی چھاؤں میں

عام سانچوں میں کبھی ڈھل نہ سکا میرا مزاج
میں نہ تھا خوف زدہ، خوف زدہ لوگوں میں

ہماری دوستی میں سخت گیری آ گئی ہے
یہ پودا نرم مٹی کا بچھونا چاہتا ہے

نام تو ترکِ تعلق کا ہے، لیکن تو نے
اپنے غم سے ہمیں آزاد کہاں رکھا ہے !
یوں تو ہر چیز سجا رکھی ہے گھر میں ہم نے
لطف جینے کا ترے بعد کہاں رکھا ہے

اپنی رائے کھو بیٹھے' احتیاط کے ڈر سے
سب کو دیکھ کر زلفی ہاتھ ہم اٹھاتے ہیں

اتنا قریب تھا' کہ بچھڑنا مُحال تھا
لیکن وہ ایک رابطۂ دید کرگیا
مر کر بھی اُس کو دیکھتے رہنے کی چاہ میں
آنکھیں کسی کو دینے کی تاکید کرگیا

اِس دل سے تمناؤں کی فہرست نہ مانگو
بچّہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا
یہ کون ہے جو میرے مقدّر میں نہیں ہے
جو مجھکو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا

الگ ہے شہر کا موسم' مرے اندر کے موسم سے
تمہارے شہر میں بارش' میں اپنے دل میں لُو رکھوں

یہ اُس کو پتا ہے کہ کہاں ذکر ہے اُس کا
جس کے لیے اک شعر ہے دیوان میں میرے
اک پھول جو اُس نے مجھے جُوڑے سے دیا تھا
وہ اب بھی تر و تازہ ہے گلدان میں میرے

تمہارے ساتھ اُڑنا چاہتے تھے
ہمارے پر مگر ٹوٹے ہوئے ہیں

روٹھ جاؤں تو نہیں کوئی منانے والا
اب کہاں ہے وہ مرے ناز اٹھانے والا
جانے کیا سوچتا رہتا ہے کُھلا دروازہ
راستہ بھول گیا ہے کوئی آنے والا

درد تو کب کا ہوگیا رخصت
اب جو باقی ہے صرف لذّت ہے
ایک تو اَنگنت مسائل ہیں
اور پھر سوچنے کی عادت ہے
بات دل تک ترے پہنچنے میں
کتنے الفاظ کی مسافت ہے

پھل دیئے جاتا ہے آنگن کا درخت
اب کوئی پتھر بھی آنا چاہیئے
اپنے چہرے سے مِٹا دینا مجھے
بات دل کی دل میں رہنا چاہیئے

اپنی ہی جانب سے، اپنی ہی طرف
لوٹنے کو ، اک زمانہ چاہیئے

آسماں اوڑھ کے اور خاک پہن کر نکلا
میں بھی کس طرح کی پوشاک پہن کر نکلا

ہم اکثر قصّہٴ ماضی ادھورا چھوڑ دیتے ہیں
کتابِ زیست کے صفحے کا کونا موڑ دیتے ہیں
نکل آتے ہیں آنسو، جب ہوائے درد چلتی ہے
پرندے رُت بدلنے پہ ٹھکانہ چھوڑ دیتے ہیں

اپنی خاموشیوں میں پنہاں تھے
لوگ باتوں کے درمیاں کھلے
اُس نے پلکیں اُٹھا کے یوں دیکھا
جیسے کشتی کے بادبان کھلے

تعلقات ہمیشہ ہی دوستانہ رہے
یہ اور بات روّیے منافقانہ رہے

جزیرے نے پھر اپنا سر اُٹھایا
سمندر سانس لینا چاہتا ہے

ہوائیں سانس روکیں ایک پل کو
دیا آرام کرنا چاہتا ہے

بندگی کی مجھے تو عادت ہے
تُو خدا بن سکے گا' سوچ ذرا

اِسی لیے تو قبا و کلاہ ڈھیلے ہیں
کوئی وجود ہے چھوٹا' کسی کا سر کم ہے
انا کے گھر میں ' ہر اک چیز ہے مگر زلفی
ہوائے تازہ کے آنے کو ایک در کم ہے

سر پہ لدا ہے آسماں' ہاتھوں میں ہے زمیں
یہ کس سفر پہ بھیج دیا' اے خدا مجھے!

سمندر بے زمیں کرنے مجھے بڑھتا ہی آتا ہے
بلا کی پختگی لیکن مرے دیوار و در میں ہے

جنہیں پوروں سے ناپا اور اپنے قد کو پہنچایا
بڑے ہوکر وہی بچّے ' لگے ہیں خود سری کرنے
سدا آنکھوں سے پٹی باندھ کر بہری عدالت نے
ہواؤں کو بلایا ہے ' دیوں کی پیروی کرنے

## تسلیم الٰہی زلفی کے یہاں ''آئینہ'' کا استعارہ

آئینہ دیکھ کر ہُوا احساس
خود سے کتنا خفا رہا ہوں میں!

آئینے کے سامنے بیٹھے' اکثر سوچتے رہتے ہیں
ہم نے اپنے چہرے پہ یہ کیسے جال بچھائے ہیں!

کُھل گیا کل رات' دیوانے پہ دیوانے کا حال
آئینے کے سامنے' جب آئینہ رکھّا گیا

آئینے میں تھی اور اک صورت
اور اک شکل میرے دھیان میں تھی

اچھا ہے ٹوٹ جائے یہ چہرے کا آئینہ
تنگ آ گیا ہوں روز کی اس دیکھ بھال سے

کیسے دیکھوں گا میں زلفیؔ اپنے چہرے کی کتاب
وہ گیا تو آرزو کا آئینہ بھی لے گیا

آئینہ زندگی کا سنبھالے ہوئے ہیں ہم
اک عمر ہوگئی ہے اسی دیکھ بھال میں

نظر کے سامنے ہیں روشنی کے آئینے
نہ کوئی نیند سے غافل' نہ کوئی خواب میں گم

جو بھی ہیں' جیسے بھی ہیں' ہم ہیں' ہماری ذات ہے
جُز فروغِ عکس ' جرمِ آئینہ کچھ بھی نہیں

ہر عکس میں جس عکس کا جلوہ نظر آیا
وہ آئینہ خانے میں اکیلا نظر آیا

آئینے بھی مرے گھر میں ہیں' کسی کا تحفہ
اور یہ رعنائی ' کسی صورتِ زیبا کی ہے

چبھنے لگی ہیں ذات کے ہاتھوں میں کرچیاں
کچھ اس طرح سے ٹوٹا ہے آئینۂ صفات

آئینے پر گرد نہیں جمنے دیتے
مسخ نہیں ہونے دیتے کرداروں کو

روح کے چاروں طرف، جسم کے ہنگامے ہیں
ایسے پتھراؤ میں کیا آئینۂ جاں ٹھہرے

اُس کی تصویر بنا کر لے جائے
آئینہ عکس چُرا کر لے جائے

کبھی ٹوٹا جو آئینہ، نکل جائے گی وہ صورت
میں اپنے گھر کی ویرانی کو، کس کے رُوبرو رکھوں!

## ''تنہا پرندے کی اُڑان'' ۱۹۹۰ء سے انتخاب

بچّے اپنے اپنے گھر کے ہو گئے
اور ہم دیوار و در کے ہو گئے

کچھ تو حالات نے رکھّا نہیں مسرور ہمیں
اور ہم نے بھی یہ دل شاد کہاں رکھّا ہے
نام تو ترکِ تعلق کا ہے لیکن تُو نے
اپنے غم سے ہمیں آزاد کہاں رکھّا ہے

دنیا کی طلب نے تو' کہیں کا نہیں رکھا
ارمان ترے در کی گدائی کے بہت تھے
تھک کر سفرِ شوق میں' پہلے وہی بیٹھے
ارمان جنہیں آبلہ پائی کے بہت تھے

گِرادیئے در و دیوار' اپنے ہی گھر کے
گلی کی راہ گزر کو کشادگی دیدی

قمیضوں کے بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں
وہ ہم سے آجکل روٹھے ہوئے ہیں

نہ آنکھ نم ہے نہ چہرے پہ کرب کے آثار
میں سلیقے سے رویا ہوں آج پہلی بار

شکستگی نہیں کوئی بدن پہ باہر سے
درک گئے مرے اندر سبھی در و دیوار

کچھ رد و بدل چاہیئے اِس گھر کی فضاء میں
کب تک رہوں میں ایک ہی منظر کی فضاء میں

فرضِ تعمیر ہر اک شخص نبھا دیتا ہے
ایک دیوار نئی گھر میں اُٹھا دیتا ہے

پرندے ہیں انہیں اُڑنا تھا آخر
پرندوں سے درختوں کو گِلا کیا

کیا تماشا ہے کہ جس کے ہاتھ میں میزان ہے
وہ منافع گِن رہا ہے' تولتا کچھ بھی نہیں

خوب دستوِ چمن ہے سبزہ و گُل کو یہاں
خوفِ نادیدہ خزاں میں مبتلا رکھا گیا
وہ جو اُڑ سکتے تھے' اُن پر بندشِ پرواز تھی
طائرانِ پر بُریدہ کو کُھلا رکھا گیا

اظہارِ سُخن میں سبھی اِمکان رکھا کر
سرہانے مگر میر کا دیوان رکھا کر
یہ کیا کہ سبھی سے ہیں ترے خاص مراسم
کچھ اپنے پرائے کی بھی پہچان رکھا کر

نظر جھکی رہی جب تک، تو ایک میلا تھا
نظر اٹھا کے جو دیکھا، تو میں اکیلا تھا

یہ عمر رائیگاں گئی، کیا کیا ، کِیا نہیں
لیکن مرے مزاج کا مجھکو مِلا نہیں
یہ کیسا تعلق تھا، پس ترکِ تعلق
نہ اُس کو شکایت ہے، مجھے بھی گِلہ نہیں

ہم سادہ دِلوں کی دنیا میں، اُمید کا تارا کوئی نہیں
دیکھو تو ہمارے سارے ہیں، سوچو تو ہمارا کوئی نہیں

کسی صورت تو اُن کی اندرونی کیفیت جانیں
وہ ہم پہ ملتفت نہ ہوں، کبھی برہم ہی ہو جائیں

گئی بہار میں سبزہ اُگا نہ پھول کِھلے
اب اِس بہار میں زخموں کو ہی ہرا رکھنا

## ''یہ عشق بھی عجیب ہے'' ۲۰۱۲ء سے انتخاب

دل کے معاملات ' دماغوں سے دُور رکھ
اِن آندھیوں کو گھر کے چراغوں سے دُور رکھ

جس کے دیوانے ہوئے تھے ہم کبھی
ایک دنیا اُس کی دیوانی ہوئی !

ایک اک بوند کو انسان ترستا دیکھا
اور بادل کو سمندر پہ برستا دیکھا

چراغ ہاتھ میں ' اور دوش پہ ہوا رکھنا
پھر اس کے بعد کہاں عمرِ بے وفا رکھنا

ہُوا ہے شوق پھر دیوار و در کا
لیے پھرتے ہیں نقشہ ایک گھر کا

نگاہ ڈالی ہے اُن تاجدار آنکھوں نے
خبر ہو لوگوں کو' یہ شاہ پھر غلام ہُوا

یہ عشق بھی عجیب ہے حالت عجیب تر
جیسے بدن سے جاں کا تعلق نہیں رہا

میں دل شکستہ تھا، تنہا تھا، اُس سے ملنے لگا
وہ ذہن و ذوق کی آسودگی تمام ہوا
ضبط کے دامن کو دھوتے کیوں نہیں
دل بھر آیا ہے، تو روتے کیوں نہیں
گھورتے رہتے ہو چھت کو رات بھر
کیا پریشانی ہے، سوتے کیوں نہیں
روشنی درکار ہے تو کھیت میں
روشنی کی فصل بوتے کیوں نہیں

اُس نے تو چاہا ہمیں، ہم عشق کی حد تک گئے
اور ساری عمر خود کو مبتلا رہنے دیا
کارِ ہستی میں کیا ہے، روح سے اپنی رجوع
کارِ دنیا، دوستوں کا مشورہ رہنے دیا
اپنی سچائی کو ہم نے سب سے پوشیدہ رکھا
دوستوں کو ان کے شک میں مبتلا رہنے دیا

یہ بھی ممکن ہے کہ، قسمت کا اشارہ ہوجائے
جو کسی اور کا ہے' اب وہ ہمارا ہوجائے

وہ مجھے نہ بھی مِلے' پر مرے امکاں میں رہے
صرف اتنا ہو کہ جینے کا سہارا ہو جائے

مدّتیں ہوگئیں سینے سے لگائے اُس کو
مدد اے شوق! کہ یہ کام ہمارا ہوجائے

قدر کم اُس کی نہ ہوجائے مری نظروں میں
یہ نہ ہو مجھ کو محبّت میں خسارہ ہو جائے

پیار مانگا نہیں ہم نے کبھی حد سے بڑھ کے
اتنا مِل جائے کہ بس اپنا گذارہ ہو جائے

جس کو ہم مِل گئے' یہ اُس کا مقدّر زلفی
اپنی قسمت میں کہاں وہ جو ہمارا ہوجائے

کس نے پھینکا ہے مری سمت یہ پتّھر زلفی
چھن سے کچھ ٹوٹ گیا ہے مرے اندر زلفی

صرف امید کے ساحل پہ کھڑے رہنے سے
پار ہوتا نہیں قسمت کا سمندر زلفی

تم اپنی آرزو کے خواب پلکوں پہ سجاتے ہو
سمندر کے کنارے ریت کے گھر کیوں بناتے ہو

میں نکل سکتا ہوں' دیواروں کو در کرتے ہوئے
یوں بھی ہوتا ہے کبھی' کارِ ہنر کرتے ہوئے
میں تمہاری روح کی انگلی پکڑ لے جاؤں گا
اِس حصارِ جسم سے باہر سفر کرتے ہوئے
عالمِ برزخ کے سیارے پہ محوِ رقص ہے
روح نورانی بدن کو اپنا گھر کرتے ہوئے

پر دیئے ہیں تو پھر اڑان بھی دے
میرے حصے کا آسمان بھی دے
میری خاموشی بھی' لکھی جائے
بے زبانی' مرا بیان بھی دے

ہوسکتا ہے' یہ اس کا اندازِ محبت ہو
بے وجہ جھگڑنے کا' کوئی تو سبب ہوگا

ہماری سنگ زنی تو فقط بہانہ ہے
پرند کو تو بہر طور اڑ کے جانا ہے
وہ معترف ہے سدا سے مری شرافت کا
کہ فائدہ تو اسے بھی، کبھی اٹھانا ہے
چھپا ہوا ہے، جو مٹھی میں، آخری پتھر
وہ ایک سنگ، ابھی میری سمت آنا ہے

تمہاری شکل اِن آنکھوں میں ایسے بس گئی ہے
بہت جانے ہوئے چہرے بھی انجانے ہوئے ہیں
کب کسی ایک کا ہُوا ہے وہ
دوستی سب سے کر رہا ہے وہ
گرد چہرے پہ جمی ہے اُس کے
آئینہ صاف کر رہا ہے وہ
جس کو چھوڑا ہے اُس کے اپنوں نے
غیر کے ہاتھ لگ گیا ہے وہ

☆☆☆

# Faiz Ahmed Faiz in Beirut

Reminiscence of

## *Tasleem Elahi Zulfi*



بیروت 1978ء : یاسر عرفات اپنے PLO آفس میں
فیض احمد فیض اور تسلیم الہی زلفی کا استقبال کررہے ہیں

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
Islamabad, Pakistan.